اپنا
راستہ
خود
بناؤ

سلسلۂ فنِ زندگی (۴)

اپنا راستہ خود بناؤ

"میں گدائے بے نوا نہیں۔ میرا نام بھکاری نہیں۔
ناکامی میری قسمت نہیں۔ میں شہزادہ ہوں۔
کامیابی میرا پیدائشی حق ہے، اور دُنیا کی کوئی
طاقت مجھے اس سے محروم نہیں رکھ سکتی۔"

(مارڈن)

سلسلۂ فنِ زندگی

۱، زندگی اور عمل

۲، آدابِ زندگی

۳، پریشان ہونا چھوڑیے

۴، اپنا راستہ خود بناؤ

۵، جینے کا قرینہ

۶، میٹھے بول میں جادو ہے

۷، کامیاب زندگی

۸، جینے کی اہمیت

اپنا راستہ خود بناؤ

فائق کامران

مکتبۂ جدید لاہور

اِنتساب

اُن نوجوانوں کے نام جو مفلس ہیں، جن کے والدین انھیں اعلیٰ تعلیم نہیں دلا سکے، جو کوئی سفارش نہیں رکھتے، مگر ان کے سینے امنگوں سے معمور ہیں، وہ کامیابی کو اپنا پیدائشی حق، اور زندگی اور عمل کو ہم معنی سمجھتے ہیں —— وہ خاک نشیں ہیں مگر ان کی نگاہیں عرش پر ہیں۔

ترتیب

فاتحانہ انداز

عزم وثبات

محبت - فاتح عالم

متفرقات

پیش لفظ

بیس پچیس سال اُدھر کی بات ہے، مجھے ادیب بننے کا شوق چرّایا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے مضامین نظم ونثر ملک کے معیاری ادبی رسائل میں شائع ہوں۔ طبیعت میں سوز وگداز زیادہ تھا جو شاید اس ادب کے مطالعے کا نتیجہ تھا جو نوحۂ غم اور نالۂ ماتم کے سوا کچھ نہ تھا۔ چنانچہ میں نے 'مصورِ غم' بننے کی ٹھان لی۔ مجھے یاد ہے، میری پہلی نظم 'ایک آرزو' رسالہ 'مخزن' میں شائع ہوئی جس کا ایک مصرع تھا ؏

غم وآلام کی دُنیا ہو اور ہوں حضرتِ فائق

گویا مجھے آرزو تھی بھی تو غم والم کی۔ مدیرِ مخزن (ابوالاثر حفیظ جالندھری) نے یہ نظم پسند کی اور مجھے لکھا: "ایک آرزو" شائع ہوجائے گی اور یہ نظم ہے بھی خوب۔" اس حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ المیہ جذبات کے اظہار کے لیے نظم اور افسانے کو وسیلہ بنا لیا۔ ان دنوں رسالہ 'شباب اردو' بھی جاری تھا۔ اس کے لیے وہ چار افسانے اور ادب پارے (جنھیں ادب لطیف کہا جاتا تھا) لکھے۔ میں سمجھتا تھا زندگی عبارت ہی غم والم سے ہے اور جن لوگوں کی قسمت میں غم اور ناکامی نہیں وہ انسانیت عظمیٰ کے معیار پر پورے اُتر ہی نہیں سکتے۔ جب نقطۂ نظر یہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس قسم کے مضامین لکھنے والے کی اپنی زندگی کیسی ہوگی۔ میں مجسمۂ غم بنتا جارہا تھا اور مسرت کا عنصر میری زندگی سے غائب ہوتا جارہا تھا۔ تصنیف مصنف کی زندگی کا عکس ہوتی ہے

یا نہیں، اس کے متعلق میں کوئی فتویٰ دینے کو تیار نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ میرے افسانے اور مضامین بہت حد تک میری زندگی کی عکاسی کرتے تھے۔

انھیں دنوں میرا ایک دوست جو بمبئی کے ایک کالج میں پڑھتا تھا امتحان سے فارغ ہو کر گاؤں پہنچا۔ میں نے داد حاصل کرنے کی غرض سے وہ رسائل اس کے سامنے رکھے جن میں میری تحریریں شائع ہوئی تھیں۔ جب بھی کوئی دوست مجھے ملنے آتا تو میں پہلا کام یہی کرتا کہ اس کے سامنے رسائل رکھتا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ رسالے میں اپنا نام (چھپا ہوا) دیکھ کر میں جھوم جھوم جاتا تھا۔ میں اسے بہت بڑی کامیابی سمجھتا تھا اور میرا خیال تھا کہ میرا دوست بھی میری اس کامیابی پر عش عش کر اٹھے گا اور مجھے خراجِ تحسین ادا کرے گا۔ لیکن اُس نے ان مضامین پر ایک نظر ڈالنے کے بعد تعریف کے بجائے مجھے متنبّہ کیا کہ جو شاہراہ میں نے منتخب کی ہے وہ کامیابی کی شاہراہ نہیں بلکہ یہ وہ پگڈنڈی ہے جو قعرِ ناکامی کو جاتی ہے۔ وہ کہنے لگا:

"عزیز دوست! میں تمھاری ذہانت و فطانت کا قائل ہوں۔ میں خوش ہوں کہ تم نے اپنا نصب العین (کسی معیاری رسالے میں کوئی مضمون شائع کرانا) حاصل کر لیا ہے لیکن یہ نصب العین معمولی ہے۔ خاص طور سے جب یہ مضامین زندگی آموز نہ ہوں۔ ہمارا وطن غلامی کے بندھنوں میں جکڑا ہے۔ ہمارے نوجوان کم حوصلہ اور تنگ نظر ہیں۔ اُنھیں نوحۂ غم سنانا ایسا کارنامہ نہیں جس پر آپ ناز کر سکیں۔ انسانی زندگی کا مقصد رونا دھونا نہیں بلکہ روتوں کے آنسو پونچھنا اور اُن کی ڈھارس بندھانا ہے مگر آپ ہیں کہ دوسروں ہی کو نہیں رُلاتے خود بھی رو رہے ہیں اور اپنی زندگی تباہ کرنے کے درپے ہیں۔ دوست! زندگی کا ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی ہے۔ اسے

یوں ضائع کرنا اچھا نہیں ۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا ۔ خدارا سنبھل جائیے اور ادیب بننے سے پہلے انسان بنیے ، ایسا انسان جو نہ صرف خود سکھی اور خوشحال ہو بلکہ دوسروں کو بھی زندگی اور مسرّت کا پیغام دے ۔ اگر آپ ادیب بنے بغیر نہیں رہ سکتے تو ایسے ادیب بنیں کہ آپ کے مضامین کے مطالعے سے لوگ اپنی بگڑی بنائیں ، اپنی ناکامیوں کو کامیابی میں تبدیل کرنے پر مستعد ہو جائیں اور نئی زندگی پائیں ۔ یہ کہہ کر میرے دوست نے مجھے نئے خیالات کی چند کتب اور رسالے دیے اور کہا کہ ان کا مطالعہ کیجیے اور اس کے بعد فیصلہ کیجیے کہ دُنیا میں کرنے کے کام کیا ہیں اور انھیں کیونکر بخوبی انجام دیا جا سکتا ہے ۔ مجھے یہ تقریر سُن کر بڑی حیرت ہوئی اور اتنی محنت کا یہ انعام پاکر کسی قدر مایوسی بھی ۔ لیکن ان کُتب اور رسائل کا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا دوست راستی پر تھا ۔ فی الواقع غم والم کو دل و دماغ پر سوار رکھنا اپنے آپ کو تباہ کرنا ہے اور نوع انسان کو غمگیں بنانا اس کی خدمت نہیں بلکہ اس سے دشمنی کے مترادف ہے ۔ ادب کی خدمت یاس اور غم کے خیالات سے ہو سکتی ہے تو مسرت اور امید کے خیالات کی تشہیر سے کیوں نہیں ہو سکتی ۔ جب قوم کو ادب کے ذریعے سے مایوسی ، شکست اور موت کا پیغام دینے والوں کی کوئی کمی نہیں تو ان میں اضافے کی ضرورت ؟ کیوں نہ اپنے لیے نئی شاہراہ منتخب کی جائے اور ادب کو مایوسی کے بجائے اُمید اور زندگی بخش خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا جائے ۔ میں نے عہد کر لیا کہ آئندہ صرف ایسے مضامین لکھوں گا جو گرتوں کو اُٹھنا سکھائیں ، کمزور اور پست ہمت انسانوں کی ہمت کو دوبالا کریں اور انھیں بتائیں کہ زندگی کا تاریک رُخ دیکھ کر حوصلہ ہار بیٹھنا مناسب نہیں ۔ اس کا ایک اور رُخ بھی ہے روشن اور تاباں ، رُخ جو مسرت

دولت اور کامیابی کا مظہر ہے۔

"اپنا راستہ خود بناؤ"۔ یہ کتاب میں نے اسی اندازِ نظر سے لکھی ہے۔
کل تک ہم غلام تھے مفلس اور پس ماندہ نوجوانوں کے لیے اپنی زندگی خود بنانے کے مواقع کم تھے۔ اولاً اس لیے کہ بدیشی حکمرانوں نے نصابِ تعلیم ہی ایسا تجویز کر رکھا تھا جو خود دار اور خود ساز بننے کے بجائے غلامِ پختہ کار بننا سکھاتا تھا۔ پھر ملک کے ان حصوں میں جن پر پاکستان مشتمل ہے، کارخانے اور پرائیویٹ تجارتی ادارے کم تھے بہت ہی کم۔ اور جو تھے وہ غیر مسلموں کے تھے جنھیں مسلمانوں سے خدا واسطے کا بَیر تھا۔ وہ اپنے اداروں میں ایک خاص فرقے اور گروہ کے نوجوانوں کو ملازم رکھتے تھے، اور ایک منظم سازش کے تحت مسلمانوں کو تجارت اور صنعت و حرفت میں تجربہ حاصل کرنے کا موقع نہ دینا چاہتے تھے مگر اب صورتِ حال مختلف ہے۔ حکومتِ پاکستان ملک کی صنعتی ترقی کے لیے خود کارخانے قائم کر رہی ہے۔ غیر سرکاری طور پر بھی ملک کے ہر حصے میں مختلف قسم کے کارخانے قائم کیے جا رہے ہیں۔ گویا نوجوانوں کے لیے صرف ملازمت کا دروازہ ہی کھلا نہیں بلکہ صنعت و حرفت اور تجارت کے میدان میں بھی ترقی کے بڑے مواقع ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ مواقع زیادہ ہیں اور انھیں حاصل کرنے والے نوجوانوں کی تعداد نسبتاً کم ہے کیونکہ پاکستانی نوجوانوں نے جس ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کی یا پرورش پائی ہے وہ کوتاہ نظری اور پست ہمتی کا ماحول تھا۔ وہ بڑی دیر تک یہ محسوس ہی نہ کر سکیں گے کہ ترقی کے مستحق صرف امرا اور وزرا کے فرزند ہی نہیں بلکہ ہر وہ پاکستانی نوجوان ہے جس کا دل امنگوں سے معمور ہے، جو بلند خیال ہے، جو مشکلات کا مقابلہ کر سکتا ہے اور جو سفارش پر بھروسا نہیں کرتا بلکہ بحرِ حیات

میں خود غوطہ لگاتا اور موتی حاصل کرتا ہے جو شاہین بچہ ہے۔

پاکستانی نوجوانوں میں یہ وسعتِ قلب، یہ بلند حوصلگی، یہ بلند نظری اس وقت پیدا ہوگی جب نصابِ تعلیم کو ان خطوط پر مرتب کیا جائے گا جن پر آزاد اقوام کے نصاب مرتب ہوتے ہیں اور پاکستانی شہریوں کے لیے زندگی بخش کتب کے تراجم اور طبع زاد تصانیف شائع کی جائیں گی، ایسی کتب جن کے مطالعے کے بعد ان کی رگوں میں زندگی کا تازہ خون دوڑنے لگے اور وہ محسوس کریں کہ فطرت نے انھیں مفلس اور پسماندہ پیدا نہیں کیا۔ وہ چاہیں اور ہمت کریں تو بلند مناصب حاصل کر سکتے ہیں اور امراء کے لڑکوں کو پچھاڑ کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر مارڈن کا قول ہے: "وہ کتاب بہت قیمتی ہے جو ہمیں انسانی فطرت سے قریب کرتی، اس کی باطنی قوتوں کے خزانے کے دروازے کھولتی اور مخفی قوتوں کو بے نقاب کرتی ہے"۔ یورپ اور امریکہ میں ایسی کتب شائع ہوتی رہتی ہیں جو عوام کو ترقی کے بامِ بلند پر پہنچنے کے لیے مددگار ہوتی ہیں۔ پلوٹارک کی "مشاہیرِ یونان و روما" اور سمائلز کی "اپنی مدد آپ" کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ ان کے مطالعے سے یورپ کے ہزاروں نوجوانوں نے اپنی زندگی بنائی۔ ڈاکٹر ولیم جیمز، جیمز ایلن اور مارڈن کی کتابیں زندگی کا پیغام ہیں اور یورپ و امریکہ میں انجیل مقدس کی سی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ایک ایک کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر مارڈن کی کتابوں کے اب تک کئی لاکھ نسخے فروخت ہو چکے ہیں امریکہ اور یورپ کے لاکھوں نوجوانوں کے لیے یہ کتب زندگی کا مژدۂ جانفزا ثابت ہوتی ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مغربی ممالک کی کایا پلٹ میں زندگی بخش کتب کا بڑا حصہ

ہے تو بے جا نہیں۔ "اپنا راستہ خود بناؤ" اسی قسم کی کتاب ہے۔ میں نے ان حکمائے کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے تاکہ میرے ہم وطن بھی زندگی کا رُخِ روشن دیکھ سکیں۔ انھیں معلوم ہو سکے کہ قدرت نے ان سے ناانصافی نہیں کی۔ اگر وہ اپنے آپ سے انصاف کرنے پہ آمادہ ہو جائیں تو جان سکتے ہیں کہ قدرت اُن پر کس قدر مہربان تھی۔ میں اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ قارئین پہ چھوڑتا ہوں البتہ اس کتاب نے اگر نشانِ راہ کا کام دیا، اسے دیکھ کر ہمارے ملک کے ماہرینِ نفسیات نے اس موضوع پہ خامہ فرسائی کی ضرورت محسوس کی، اور مفلسی غربت اور پسماندگی کے ماحول میں پلنے اور تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے کسی نوجوان نے کامیابی کے میدان میں داخل ہونے اور اپنا راستہ خود بنانے کا تہیہ کر لیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگ گئی ہے۔

فائق کامران

اپنا راستہ خود بناؤ

روایت ہے کہ ایک زمیندار خاصی زرعی جائداد اور دو لڑکے چھوڑ مرا۔ بڑے لڑکے کا نام اکبر سمجھیے اور چھوٹے کا اصغر۔ اکبر پرلے درجے کا عیار اور خود غرض تھا۔ اُس نے اپنے چھوٹے بھائی کو دانستہ تعلیم و تربیت سے محروم رکھا تاکہ جب اصغر جوان ہو تو اُسے جائداد تقسیم کرانے کا احساس ہی نہ ہونے پائے اور وہ خود ساری جائداد کا مالک بنا بیٹھا رہے۔

اکبر اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اصغر جوان ہونے کے بعد بھی سارا دن کھیت میں مزدوروں کے ساتھ کام کرتا، بھائی کی جھڑکیاں سہتا، بھابی کی ملامت سنتا مگر اُف تک نہ کرتا۔ اسے پہننے کے لیے پھٹے پرانے کپڑے دیے جاتے۔ کھانے کے لیے اکبر کے پُرتکلف دسترخوان کا پسماندہ اور رہنے کے لیے ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی دی گئی تھی مگر وہ لبِ شکایت وا نہ کرتا۔ اس کی خودی سوئی پڑی تھی۔ اُسے احساس تک نہ تھا کہ اس کا بھائی غاصب ہے اور اس سے اپنا حصّہ حاصل کرکے آرام کی زندگی بسر کرسکتا ہے۔

ایک دن اصغر کھیت پر مزدوروں کے لیے کھانا لے کر گیا تو لوٹتے وقت لوٹا وہیں بھول آیا۔ جب اس کی اطلاع اکبر کو ہوئی تو اس نے ملازموں کے سامنے اصغر

کی خوب گت بنائی اور حکم دیا کہ وہ اسی وقت کھیت پر جائے اور لوٹا اٹھا لائے ورنہ کھانا نہ ملے گا۔ رات تاریک تھی اور کھیت گھر سے خاصا دور۔ اصغر آج پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ وہ مدت سے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہا تھا، بھائی کے مظالم خاموشی سے برداشت کر رہا تھا مگر آج پہلی بار اُس نے محسوس کیا کہ اس زندگی سے نجات حاصل کرنی چاہیے۔ اگر اُسے یقین ہوتا کہ کہیں اور ٹھکانا مل سکے گا، اُسے کوئی آدمی ملازم رکھ لے گا تو وہ اسی وقت اس گھر کو جہاں اس کے لیے مسرت تھی نہ آرام ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیتا مگر ڈر تھا تو اس بات کا کہ اکبر کے ڈر سے اسے کوئی پناہ نہ دے گا۔ کوئی ملازم نہ رکھے گا کیونکہ اکبر کی رسائی سرکار دربار میں تھی۔ پولیس اس کی مٹھی میں تھی۔ اور تو اور علاقے کے بدمعاش بھی اس کے پروردہ تھے، اس لیے وہ بھی اس سے ڈرتے تھے اور کوئی اُسے مخالف بنانے پر تیار نہ تھا۔

اصغر با دلِ ناخواستہ لوٹا اٹھانے جا رہا تھا۔ اُس کے دل میں بغاوت کا شعلہ پہلی بار روشن ہوا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ جب مناسب موقع ملے گا وہ بھاگ جائے گا۔ کسی اور ملک میں جا کر زندگی کے بھلے بُرے دن بسر کر لے گا اور ظالم بھائی کا مُنہ کبھی نہ دیکھے گا، اس بھائی کا جو اسے ہر روز ذلیل کرتا ہے۔

اصغر انہیں خیالات میں غرق دھیرے دھیرے کھیت کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک آدمی جس کا لباس سفید ہے، دودھ جیسا سفید، کھیت کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ اصغر بڑا حیران ہوا کہ اتنی رات گئے یہ شخص یہاں کیا کر رہا ہے۔ اس نے اجنبی سے دریافت کیا کہ وہ کون ہے۔ اجنبی نے جواب دیا:

"میں اکبر کا نصیبا ہوں اور کھیت کی دیکھ بھال کر رہا ہوں کہ کوئی اس کی فصل کو

نقصان نہ پہنچانے پائے۔"

اصغر:۔ نصیبا! اکبر کا نصیبا! اگر نصیبا صرف اکبر ہی کا ہے یا اور لوگ بھی نصیبا رکھتے ہیں؟

اجنبی:۔ قدرت نے کسی کو بے بخت اور بے نصیب پیدا نہیں کیا، ہر انسان کا نصیبا موجود ہے، زندہ وسلامت ہے۔

اصغر: کیا میرا بھی "نصیبا" زندہ ہے؟ اگر ہے تو وہ کہاں محوِ خواب ہے؟ تم یہاں پہرہ دے رہے ہو، اکبر کے کھیت کی حفاظت کر رہے ہو لیکن میرے نصیبے نے تو کبھی میرا حال دریافت نہیں کیا۔ اسے شاید معلوم ہی نہیں کہ میں اکبر کے ظلم وستم سہہ سہہ کر زندگی سے بیزار ہو چکا ہوں۔

یہ کہتے وقت اصغر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اس کا دل رو رہا تھا، اسے اکبر کے مظالم ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔

اجنبی:۔ کیوں نہیں! تمہارا نصیبا بھی موجود ہے اور اس وقت "جزیرہ بخت" میں محوِ خواب ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ دنیا میں معدودے چند اشخاص ایسے ہوتے ہیں جن کا نصیبا ان کی پیدائش سے پیشتر بیدار ہوتا ہے۔ انھیں تکالیف کا مُنہ کم دیکھنا پڑتا ہے۔ باقی سب کو اپنا نصیبا خود جگانا پڑتا ہے۔ جد وجہد کر کے کڑیاں جھیل کر اپنی قسمت آپ بنانی پڑتی ہے۔

اصغر:۔ اگر آپ بتا سکیں کہ میرا نصیبا کہاں ہے تو میں ضرور اُس تک پہنچ کر دم لوں گا۔

اجنبی:۔ وہ سامنے جو گھنا جنگل ہے جس کی وسعت سخی کے دل سے بھی زیادہ

ہے، اس سے پرے ایک پہاڑ ہے جس کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں
اگر تم اس جنگل کو عبور کر سکو اور اس پہاڑ کو پھلانگ سکو تو سمندر کے کنارے پہنچ
جاؤگے۔ وہاں سے سمندر کے عین درمیان ایک جزیرہ نظر آئے گا۔ بس وہیں
تمھارا نصیبا سو رہا ہے۔ اگر اسے جگا لو تو تمھاری بگڑی بن سکتی ہے۔ تم اکبر کے
مظالم سے نجات حاصل کر سکتے ہو اور اکبر سے زیادہ خوش حال بن سکتے ہو کیونکہ
جو لوگ کڑیاں جھیل کر، جان جوکھوں میں ڈال کر اپنا نصیبا جگایا کرتے ہیں۔ وہ
بہت کچھ پا لیتے ہیں۔

اصغر: "میں اکبر کے مظالم سے نجات حاصل کر سکتا ہوں، اپنے نصیبے کو جگا کر اکبر سے
زیادہ دولت حاصل کر سکتا ہوں، شان و شوکت سے رہ سکتا ہوں تو میں ضرور اپنے
نصیبے کو جگاؤں گا۔ ذلت کی موجودہ زندگی سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد میں
جان بھی جاتی رہے تو کوئی مضائقہ نہیں"

اصغر اب نیا انسان بن چکا تھا، اس کی خودی بیدار ہو چکی تھی۔ اب وہ اپنے آپ کو
اکبر سے فروتر سمجھنے اور اس کے لیے کام کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس نے لوٹا اٹھایا
اور چل پڑا ــــ گھر کی طرف؟ نہیں، سامنے جنگل کی طرف۔

اصغر کیونکر "جزیرۂ بخت" تک پہنچا؟ اس نے اپنے بختِ خفتہ کو کس طرح جگایا؟
کس صورت حسین بیوی، عالی شان محل اور زر و جواہر حاصل کیے؟ بھائی سے کس طریق
پر انتقام لیا؟ بہت پُر لطف داستان ہے مگر اس وقت مجھے ان تفصیلات سے غرض
نہیں۔ مجھے تو صرف یہ بتانا ہے کہ اگر آپ بھی چاہیں تو اصغر کی طرح اپنے نصیبے کو جگا
سکتے ہیں اور کارسازِ عالم نے انسان کے لیے جو نعمتیں پیدا کی ہیں انھیں

حاصل کر سکتے ہیں۔

بلاشبہہ ہر انسان اپنے نصیبے کو جگا کر جاہ و منصب حاصل کر سکتا ہے۔

دنیا میں وہ افراد انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جن کا نصیبا اُن کے عالمِ وجود میں آنے سے پہلے بیدار ہوتا ہے یا اُن کی پیدائش کے ساتھ وہ بھی انگڑائی لیتا ہے۔ باقی سب اسے خود جگاتے ہیں۔ بنجمن ڈسرائیلی، فرنکن، ابراہام لنکن، مصطفیٰ کمال، رضا خان پہلوی، قائدِ اعظم، مہاتما گاندھی، سٹالین، غرض زمانۂ ماضی و حال کے بہت سے بڑے آدمیوں نے اپنے بختِ خفتہ کو خود جھنجھوڑا اور اسے مجبور کیا کہ بیدار رہے۔ انھوں نے اپنا راستہ خود بنایا اور اقوام و ملل کے محبوب راہنما بنے۔

سیاسی لیڈروں کی طرح دنیا کے کئی ارب پتی کارخانہ دار بھی غریب والدین کے گھر پیدا ہوئے مگر انھوں نے ہمت و استقلال سے کام لیا، جدوجہد، مسلسل جدوجہد کی، مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا، جان جوکھوں میں ڈال کر جزیرہ بخت تک پہنچے، اپنے نصیبے کو جگایا اور راہبر بنے۔ کارنیگی، راک فیلر اور فورڈ اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سائنس اور فنونِ لطیفہ کے ماہرین کے سوانح حیات کا مطالعہ کیجیے۔ ان میں سے اکثر ابتدائی تعلیم بھی حاصل نہ کر سکے۔ ان کے والدین نان و نفقہ کے محتاج تھے۔ انھیں تعلیم کیونکر دلاتے؟ مگر ان ہونہار اور ذہین نوجوانوں نے محنت کی۔ اپنے نصیبے کو جگایا اور علم و حکمت کی دنیا میں شہرت حاصل کی۔ ان میں سے بعض نوجوانوں نے دن بھر محنت مزدوری کی مگر رات کو مدارسِ شبینہ میں داخل ہو کر یا کسی بزرگ کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے علم حاصل کیا۔ بعض کے متعلق تو مشہور ہے کہ وہ سڑکوں کے لیمپوں کی روشنی میں مطالعہ کیا کرتے تھے۔ ان میں اتنی استطاعت بھی نہ تھی کہ تیل خرید

سکتے۔ یہ محنت بیکار نہ گئی اور وہ دن بھی آیا جب اُن کی قابلیت کا طوطی بولنے لگا۔

ایک مغربی مفکر کا قول ہے: "کامیابی کے مندر میں داخل ہونے کا راستہ ہر انسان کو خود بنانا پڑتا ہے۔ جب کوئی فرد اس مندر میں داخل ہو جاتا ہے تو راستہ بند ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اس کی اولاد کو بھی اس راستے سے اندر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔" اس قول کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کامیاب باپ بیٹے کے لیے دولت چھوڑ سکتا ہے، جائداد بنا سکتا ہے لیکن حقیقی عظمت نہیں دلا سکتا۔ آپ کامیاب افراد کے نام لیجیے اور دیکھیے کہ ان میں سے کس کس کی اولاد کا نام آپ جانتے ہیں۔ کامیاب افراد کی اولاد ممکن ہے ہنگامی شہرت حاصل کرے، کسی ملازمت کے حصول میں کامیاب ہو جائے، سفارش سے اس کا بگڑا ہوا کام راس آجائے لیکن یہ سہارے زیادہ دیر تک اُن کا ساتھ نہیں دیا کرتے۔ جب مشہور آدمی کی آنکھیں بند ہوتی ہیں تو دنیا دیر تک اُس کی اولاد کا لحاظ نہیں کرتی کیونکہ اس عرصے میں کوئی اور بڑا آدمی میدانِ حیات میں داخل ہوتا ہے اور لوگوں کی توجہ کو اپنی جانب پھیر لیتا ہے۔ اب اس کی اولاد کا لحاظ کیا جائے یا اس کی اولاد کا جو طویل عرصے سے نیند کے مزے لے رہا ہے اور گوشۂ قبر سے اٹھ کر گلہ بھی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اوقات بڑے آدمی کی اولاد سے وہ نوجوان آگے بڑھ جاتے ہیں جنھوں نے زندگی کا سفر اُن سے بعد اور بُرے ماحول میں شروع کیا مگر چند ہی سال میں اپنی قابلیت اور محنت سے اپنی جگہ بنا لی اور سفارش والے نوجوانوں کو پیچھے چھوڑ کر مراتب حاصل کیے۔

سفارش کسی حد تک وسیلۂ ظفر ضرور ہے لیکن یہ ظفر دیرپا نہیں ہوتی۔ سفارشی نوجوانوں پر محنتی نوجوانوں کو یہ تفوق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی ترقی کے لیے اپنے دست و بازو کا سہارا بناتے ہیں، محنت کرتے ہیں، استقلال سے کام لیتے ہیں، مشکلات پیش آتی ہیں تو اُن کا حل خود ڈھونڈتے ہیں۔ اس طرح وہ دقتوں کے خوگر ہو جاتے ہیں اور میدان پہ میدان مارتے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کامیابی کے رنگ محل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جب سفارشی نوجوان مُنہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ انھوں نے بے سہارے چلنا سیکھا ہی نہیں، پھر سہارے کے بغیر کیونکر کامیاب ہوں؟

میں ایک ایسے صحافی کو جانتا ہوں جو ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ وہیں اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور وہیں زندگی کا خاصا حصہ بسر کیا۔ وہ ورنیکلر مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد سلسلۂ تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور دیہاتی مدرّس بن گیا۔

وہ جس علاقے کا باشندہ ہے اور جہاں اس نے زندگی کے قیمتی لمحات اور اپنا شباب گزارا وہاں ادیب بستے ہیں نہ شاعر۔ اس علاقے میں کوئی لائبریری نہیں۔ وہاں کبھی کوئی مشاعرہ نہیں ہوا اور پاکستان بننے سے پہلے تو اس علاقے میں شاید ہی کوئی سیاسی لیڈر گیا ہو مگر تہذیب و تمدّن کے مراکز سے دُور رہنے والے اس نوجوان نے ذاتی مطالعے سے اتنی قابلیت بہم پہنچائی کہ اس کے مضامین ملک کے مؤقر جرائد میں شائع ہونے لگے۔ اس نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ کسی استاد سے مدد لیے بغیر اعلیٰ امتحانات کی تیاری شروع کر دی۔ آج وہ گریجویٹ ہے۔

اس دیہاتی نوجوان کی کامیابی کا راز اس کی خود اعتمادی ہے۔ وہ زندگی کے جس شعبے میں داخل ہوتا ہے چند سال کے اندر اندر اس میں اپنے ساتھیوں کو پیچھے

چھوڑ جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ آج سے تقریباً پانچ سال پیشتر وہ ایک روزنامے کے ایڈیٹوریل سٹاف میں مترجم کی حیثیت سے شامل ہوا، مگر گذشتہ تین سال سے وہ ایک موقر جریدے کا مدیرِ اعلیٰ ہے۔ وہ دو سال کی قلیل میعاد میں مترجم سے مدیرِ اعلیٰ بنا۔ وہی دیہاتی نوجوان جسے نہ تو لیڈروں کی تقریریں سننے کا کبھی موقع نہ ملا، نہ اس نے سیاسیات کی باقاعدہ تعلیم ہی حاصل کی۔

آپ اس سے ملاقات کیجیے تو اسے زرد رو یا زیادہ محنت کے باعث وقت سے پہلے بوڑھا نہ پائیں گے بلکہ جوان اور تنومند دیکھیں گے اور اگر آپ اسے اس کی کامیابی پر ہدیۂ تبریک پیش کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ معدودہ ترقی پر قانع نہیں اور اس کامیابی کو وہ اپنی قابلیت کا پورا معاوضہ نہیں سمجھتا۔ وہ کہے گا "میری منزل ابھی بہت دور ہے بہت دور اور میں اس تک پہنچ کر دم لوں گا" اور زبان سے یہ الفاظ ادا کرتے وقت اس کی آنکھوں میں جو چمک پیدا ہوتی ہے وہ ظاہر کرتی ہے کہ اس کی قسمت میں ناکامی نہیں اور سچ یہ ہے کہ اس ہمت و ارادہ کے نوجوان کامیاب ہو کر رہتے ہیں اور خدا اُن کی مدد کرتا ہے ضرور مدد کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے وطن میں جب تک خویش پروری، جنبہ داری اور ناروا حمایت کی خباثتیں موجود ہیں ان نوجوانوں کے لیے جو اپنا راستہ خود بنانا اور ترقی کی دوڑ میں حصہ لینا چاہتے ہیں، قدم قدم پر دشواریاں ہیں، جگہ جگہ رکاوٹیں ہیں اور یہ مشکلیں بھی نرالی قسم کی ہیں۔ جب افسر اپنے بھتیجے کو برانچ کا انچارج بنانے پر ادھار کھائے بیٹھا ہو تو محنتی اور قابل نوجوانوں کی قابلیت ان کے لیے کیونکر سُودمند ثابت ہو سکتی ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ رکاوٹیں ان

لوگوں کا ان جوانوں کا جن کے دل ودماغ نشۂ کامیابی سے مست ہیں جو ہر قیمت پر اور ہر حال میں آگے بڑھنے کا تہیہ کر چکے ہیں، کچھ بگاڑ نہیں سکتیں کیونکہ اس قسم کے نوجوان اپنی قابلیت میں اضافہ کرکے کام کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دینے کی اہلیت پیدا کرکے سفارش کو بے اثر بنا دیتے ہیں۔

اگر آپ کسی دفتر میں کلرک ہیں اور آپ کو ہر وقت یہ خدشہ لاحق رہتا ہے کہ آپ کا حریف سفارش کے زور پر آپ سے بازی لے جائے گا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ہتھیار ڈال دیں۔ دل شکستہ ہو کر قسمت پر آنسو بہانا شروع کر دیں۔ ایسا کرنے سے آپ کا مستقبل سدھر جائے گا؟ نہیں۔ آپ کی مشکلات کم ہو جائیں گی؟ کبھی نہیں۔ تو پھر شیون کی ضرورت؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ دل لگا کر کام کرتے رہیں، کسی مناسب لمحے کا انتظار کریں اور جب وقت آئے تو اس سے فائدہ اٹھائیں۔ بالکل اس طرح جس طرح شاہ جہان کے دربار کے ایک معمولی ملازم نے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس نوجوان نے اس وقت جب وہ مرغی خانے کا انچارج یا لائبریرین تھا۔ وزیر بننے کی استعداد پیدا کی اور جب وقت آیا تو اس نے فائدہ اٹھایا یعنی جب شاہِ ایران کے مکتوب کے ایک نکتے کا جواب اور کوئی نہ دے سکا تو وہ آگے بڑھا اور کہا: "وہ شاہِ ایران کے سوال کا جواب دے سکتا ہے مگر اس شرط پر کہ جواب وہ خود لکھے گا" اور اس نے "شاہ ہند" کے بجائے "شاہ جہان" کا لقب اختیار کرنے کی وجہ بتائی۔ شاہ ایران اس خط کو پڑھ کر عش عش کر اٹھا اور اس نے لکھا "مجھے یقین ہے کہ میرے خط کا جواب ہند کے وزیر اعظم نے دیا ہوگا اور اگر یہ شخص وزیر اعظم نہیں تو میں اسے ایران کا وزیر اعظم بنانے کو تیار ہوں۔" یہ جواب پڑھتے ہی شاہ جہان نے اس نوجوان کو

جس کی کوئی سفارش نہ تھی، جو خاندانی نہ تھا، وزارتِ عظمیٰ کی گدی سونپ دی۔

اگر آپ ترقی کے متمنی ہیں اور اس کے لیے استعداد بہم پہنچا لی ہے تو اپنے افسر کو یقین دلائیں کہ آپ سفارشی کلرک کی نسبت زیادہ مفید ہیں۔ جب وہ سالانہ رپورٹ مرتب کرنے میں دقت محسوس کرے تو آگے بڑھیے اور اپنی قابلیت کے جوہر دکھایئے تاکہ افسر کو معلوم ہو جائے، آپ کو نظر انداز کرنا اپنی راہ میں مشکلات پیدا کرنا ہے۔

آج کل ہر نوجوان کو اپنی قابلیت میں اضافہ کرنے کے مواقع حاصل ہیں۔ تقریباً ہر بڑے شہر اور قصبے میں ٹائپ رائٹنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھنے کی سہولتیں میسر ہیں۔ آپ ہر روز ایک دو گھنٹے صرف کر کے چھ ماہ میں اچھے ٹائپسٹ، سٹینوگرافر یا اکاؤنٹنٹ بن سکتے ہیں اور سال دو سال میں سکرٹری کی اسامی قبول کرنے کی اہلیت پیدا کر سکتے ہیں۔ آپ کا مقابلہ وہ سفارشی کلرک جو جانتا ہے کہ اس کا سہارا ہے، اس لیے محنت نہیں کرتا، کیونکر کر سکتا ہے اور اگر افسر ناانصافی پر تلا بیٹھا ہے، اس نے آپ کی قابلیت کا ذرا لحاظ نہیں کیا اور آپ کا گریڈ اپنے عزیز کو دے دیا ہے یا اسے برانچ کا انچارج بنا دیا ہے تو گھبرایئے نہیں، حواس کو قابو میں رکھیے، اپنی تعلیمی قابلیت میں اضافہ کیجیے۔ وہ برانچ انچارج میٹریکولیٹ ہے تو آپ ڈگری حاصل کیجیے اور اس کلرک کو جسے آپ سے ایک درجہ آگے کر دیا گیا ہے، کہیے کہ وہ کرسی آپ کے لیے خالی کر دے۔ اگر آپ نوجوان ہیں، ذہین ہیں، اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہو چکے ہیں تو میں کہوں گا کہ اعلیٰ ملازمت کے امتحانِ مقابلہ میں شامل ہو جائیے اور اس افسر کی کرسی پہ نگاہ کیوں نہ رکھیے جس نے آپ کا حق چھین کر دوسرے کو دیا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تعلیمی قابلیت میں اضافہ کرنے والے لوگ اپنے ساتھیوں

سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ اتنے آگے کہ پھر وہ ساتھی جو موجودہ قابلیت پر قانع رہتے ہیں، اُن کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے اور ایک میٹرکولیٹ کے لیے گریجویٹ بننا دشوار نہیں۔ اگر ایک دیہاتی نوجوان اساتذہ کی امداد کے بغیر گریجویٹ بن سکتا ہے، اور ایسے علاقے میں رہتے ہوئے جہاں علم و ادب کے چرچے نہیں، ادیب اور صحافی بن سکتا ہے تو پھر آپ کیوں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنا مستقبل درخشاں نہ بنائیں۔

زندگی میں ہر انسان کو کم از کم ایک بار ترقی کا موقع ضرور ملتا ہے مگر اس سے فائدہ وہی اٹھاتے ہیں جو اسے سامنے سے پکڑتے ہیں یعنی اس سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے پہلے سے تیار رہتے ہیں۔ جو لوگ اس اصول کی پروا نہیں کرتے وہ ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں۔

ہمارا ملک ترقی یافتہ نہ سہی لیکن ترقی کے مواقع ہر کسی کے لیے مہیا ہیں۔ اُس ملک میں جو صنعتی اور تجارتی منازل طے کر رہا ہو بلکہ سفرِ ترقی کا آغاز ہی کیا ہو، انفرادی ترقی کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں نئے نئے تجارتی ادارے اور کارخانے قائم ہو رہے ہیں۔ انھیں کون چلائے گا؟ صاف ظاہر ہے کہ ہمارے وطن کے وہ نوجوان جو اپنے آپ میں اہلیت پیدا کریں گے۔ یہی نوجوان کل غیر ملکی ماہرین کی جگہ سنبھالیں گے مگر صرف اس صورت میں کہ وہ اپنی موجودہ حالت پر قناعت نہ کریں، اپنی منزلِ مقصود 'چرخِ نیلی فام' سے پرے سمجھیں اور اس تک پہنچنے کے لیے جان کی بازی لگا دیں۔

کامیابی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے مگر حصولِ کامیابی کی کڑی شرط یہی ہے کہ کامیابی کے مندر میں داخل ہونے کا راستہ ہر شخص کو خود بنانا پڑتا ہے۔ اگر

کسان کا بیٹا محمد علی پاکستان کا وزیر اعظم بن سکتا ہے، اگر ایک پٹواری کا بیٹا کو آپریٹو سوسائٹی کا رجسٹرار اور ایک اور پٹواری پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کا صدر، ایک مدرس فرانس کا صدر، ایک دیہاتی نوجوان جس نے مدرسے میں ابتدائی تعلیم حاصل نہیں کی، ادیب اور پروفیسر بن سکتا ہے تو آپ بام عروج تک پہنچنا کیوں ناممکن سمجھیں؟ اگر آپ بلند خیال ہیں، عالی حوصلہ ہیں، کامیابی کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے سے نہیں ہچکچاتے۔ اگر آپ، ڈاکٹر مارڈن کے اس قول کو ہر وقت مدِ نظر رکھتے ہیں کہ "کامیابی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے" تو آپ کامیاب ہو کر رہیں گے اور دنیا کی کوئی طاقت، کوئی مخالفت کوئی رکاوٹ آپ کا راستہ نہ روک سکے گی۔

"اپنی راہ خود بنانا" ترقی کا گر ہی نہیں، مسرت کا نسخہ بھی ہے۔ جو چیز جدوجہد کے بعد حاصل کی جاتی ہے وہ ہر انسان کو عزیز ہوتی ہے۔ اپنی محنت ٹھکانے لگتے دیکھ کر اُسے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ننھا بچہ تتلی پکڑ کر خوش ہوتا ہے۔ اگر اس کی آپا اُسے تتلی پکڑنے میں مدد دے تو وہ قبول کرے گا۔ اگر تتلی پکڑ کر اس کے حوالے کر دی جائے تو بھی ننھے میاں خوش ضرور ہوں گے لیکن اس وقت اس کی مسرت کا پیمانہ چھلک جائے گا اور وہ خوشی سے ناچنے لگے گا جب خود تتلی پکڑے گا۔ وہ اپنی ماں بہن بلکہ گھر کے تمام ارکان سے اپنا کارنامہ بار بار بیان کرے گا۔ جب اس کا ابّا دفتر سے واپس آئے گا تو ان سے خوشی خوشی اپنی کامیابی کا ذکر کرے گا۔ آپ نے کبھی کسی شکاری کا ڈرائنگ روم نہیں دیکھا۔ اس میں ہرن، لومڑی اور شیر کی کھالیں نظر آئیں گی اور شکاری ہر معرکے کی پوری تاریخ بیان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دے گا۔ یہ صرف شکاری پر موقوف نہیں، ہر آرٹسٹ اپنی تخلیق پر ناز کرتا

ہے۔ اگر آپ اُس کے شہکار کی قیمت ادا نہیں کر سکتے تو فکر نہ کیجیے، اس شہکار کی تعریف
میں دو چار جملے تو کہہ سکتے ہیں اس میں بُخل نہ کیجیے۔ پھر آرٹسٹ کے چہرے پر نگاہ ڈالیے
وہ یقیناً مسرور دکھائی دے گا۔ ایک ان پڑھ انسان اپنی زندگی قلی کی حیثیت سے شروع
کرتا ہے۔ سال دو سال میں محنت کر کے قلی جمعدار بن جاتا ہے۔ گو اس ترقی پر اس کی
تنخواہ میں بہت زیادہ اضافہ نہ ہوگا لیکن اسے مسرّت ضرور ہوگی۔ کہاں وہ حالت، کہ
سارا دن بوجھ اٹھاتے اٹھاتے کمر دُکھنے لگتی تھی، کہاں یہ مزے کہ چھڑی ہاتھ میں لیے
ادھر سے اُدھر ٹہل رہا ہے اور دوسروں کو بوجھ اٹھانے کا حکم دیتا ہے۔ اس کا اُس
کی زندگی پر بڑا خوشگوار اثر پڑے گا۔ بعید نہیں کہ اسے قلی جمعدار سے ترقی کر کے ایک
درجہ اور آگے بڑھنے کا خیال پیدا ہو جائے۔ اسے کہتے ہیں ایک پنتھ دو کاج۔ محنت
سے ایک تو اس کی مالی حالت بہتر ہوتی ہے دوسرے مسرّت حاصل ہوتی ہے۔

بعض اوقات اپنا راستہ خود بنانے کے خواہاں نوجوانوں کو ایسی مشکلات پیش
آتی ہیں کہ ان پر قابو پانا ان کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ پھر بھی وہ اپنا راستہ بنانے کی
جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں۔ ایک ناکامی سے مایوس نہیں ہوتے بلکہ پھر کوشش
کرتے ہیں۔ ان کی زندگی اسی جدوجہد میں ختم ہو جاتی ہے اور وہ دُرِ مقصود حاصل کیے
بغیر چل بستے ہیں۔ یہ جذبہ اپنا نصب العین حاصل کرنے کے لیے یہ ثابت قدمی،
یہ سرفروشی، ناکامی کی شکست سے بچنے کے لیے یہ استقلال لائق ستائش ضرور ہے۔
لیکن اس بات کا خیال ضرور رکھیے کہ کہیں آپ چاند کو پکڑنا تو نہیں چاہتے ؟ آپ ناممکن
کو ممکن بنانے کے طالب تو نہیں ؟ آپ اس چیز کے حصول میں اپنی طاقت تو ضائع
نہیں کر رہے جس کا حصول بشری طاقت سے بعید ہے ؟ اس صورت میں سوچیے

کہ بار بار آپ کو ناکامی کا منہ کیوں دیکھنا پڑتا ہے۔ کہیں آپ بائیسکل لے کر موٹر دوڑ کی دوڑ میں حصہ تو نہیں لے رہے ؟ آپ نے ڈگری حاصل نہیں کی مگر چاہتے ہیں کہ آپ کو یونیورسٹی کے شعبۂ سائنس کا انچارج بنا دیا جائے یا کیل گاڑنا تو جانتے نہیں مگر چاہتے ہیں کہ ایگزیکٹو انجینئر کی اسامی کے لیے آپ کو منتخب کیا جائے۔ ایسی صورت میں اپنے طرزِ عمل پر غیر جانبدار بن کر نکتہ چینی کیجیے۔ ناکامی کے اسباب معلوم کیجیے۔ اگر آپ یہ نتیجہ اخذ کریں کہ چٹان سے سر ٹکرا رہے ہیں، ایسی چٹان سے جس کا پھوڑنا محال نہیں ناممکن ہے تو سر پھوڑنے کے بجائے عقل و خرد سے کام لیجیے اور اس چٹان کو توڑنے میں طاقت ضائع کرنے کے بجائے کوئی اور راستہ ڈھونڈیے۔

آپ نے دریا کی گزرگاہ کبھی نہیں دیکھی ؟ اس میں کتنے موڑ اور خم ہوتے ہیں۔ یہ موڑ دریا کی شکست یا چٹانوں اور بلند پہاڑوں کے مقابلے سے گریز کی علامت نہیں بلکہ اس بات کے مظہر ہیں کہ رکاوٹیں کسی کو منزلِ مقصود تک پہنچنے سے نہیں روک سکتیں۔ دریا چاہتا کیا ہے ؟ سمندر سے وصال۔ دریا کے پانی کا نصب العین کیا ہے ؟ سمندر کے پانی میں مل کر سمندر بن جانا۔ چٹان اور ٹیلے کو راستے سے ہٹانا اس کا نصب العین نہیں اس لیے اس کا انتظار نہیں کرتا کہ کب چٹان ہٹے تو وہ آگے بڑھے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ چٹان سے اُلجھنا بے سود ہے تو متبادل ڈھونڈتا ہے اور اس میں کامیاب ہو کر رہتا ہے۔ یوں وہ چٹانوں سے بچتا، ٹیلوں سے کتراتا سمندر تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ چٹان کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے اپنی طاقت ضائع نہیں کرتا، نہ اصرار کرتا ہے کہ آگے اس وقت بڑھے گا جب چٹان راستہ دے گی۔ وہ رکاوٹ کو دُور نہیں کر سکتا تو رُک نہیں جاتا ؛ مراجعت اختیار نہیں

کرتا بلکہ کوئی اور راستہ تلاش کرتا ہے، وہ راستہ جو اُسے منزلِ مقصود تک لے جائے۔
اِس حکمتِ عملی سے وہ سمندر تک پہنچ جاتا ہے۔

زندگی کے میدان میں آگے بڑھتے وقت اگر آپ کو بھی کہیں رُکنا اور مڑنا پڑتا ہے تو پہلے غور کیجیے کہ مڑنا مصلحت پر مبنی ہے یا نہیں اور جب محسوس کریں کہ مڑے بغیر چارہ نہیں تو پھر تامّل نہ کیجیے۔ اگر عقلِ سلیم کہتی ہے "یہ رکاوٹ دُور ہوسکتی ہے، اس کا ہٹانا انسانی بس میں ہے، ایسے لوگ ہو گزرے ہیں جنھوں نے اس قسم کی رکاوٹیں دُور کرکے اپنا راستہ بنایا" تو اس سے ضرور تصادم کیجیے۔ لیکن نمود و نمائش اور جھوٹے وقار کے لیے اکڑفوں کی سفارش نہیں کی جاسکتی۔ آپ کا نصب العین کامیاب انسان بننا ہے۔ اپنے بچوں کے لیے خوش نما مکان اور جائداد حاصل کرنا ہے۔ کسی نشست سے کامیاب ہوکر اسمبلی کا رُکن بننا اور تاجِ وزارت زیبِ سر کرنا ہے۔ ملّت کے لیے مفید ثابت ہونا اور وطن کو دُنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں لا بٹھانا ہے۔ غرض آپ کا منتہائے نظر ہے کامیابی تو اس کے لیے ضروری نہیں کہ جس شعبے کو ایک بار غلطی سے یا جلدی میں اختیار کرچکے ہیں اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کی بار بار کوشش کرنے پر بھی مُنہ کی کھاتے ہیں اس سے چمٹے رہیں۔ اسے اس لیے چھوڑنا گوارا نہ کریں کہ ساتھی کیا کہیں گے یا برادری والے مضحکہ اڑائیں گے۔

مانا کہ آپ نے اس شعبے میں برسوں کام کیا ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ اس میں کامیاب ہونا آپ کا فطری حق ہے۔ لیکن یہ بھی تو بتائیے کہ پھر آپ اب تک کامیاب کیوں نہیں ہوئے، کیا آپ کی ناکامی اس بات کا ثبوت نہیں کہ یا تو آپ

نے اپنے لیے غلط شاہراہ منتخب کی ہے یا پھر آپ کی مساعی خام ہیں ؟ اگر مساعی خام ہیں
تو ان کی اصلاح کیجیے اور اگر راستے کے انتخاب میں غلطی کی ہے :

کیں رہ کہ تو مے روی بہ ترکستان است

تو پھر اصرار اور بے جا ضد اچھی نہیں -آپ انچارج بننا چاہتے ہیں کسی کارخانے
کے۔ مگر انچارج بننے کے لیے جس قسم کی قابلیت درکار ہے وہ اپنے آپ میں پیدا
کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ سیاسیات سے دلچسپی لیتے ہیں یا مشاعروں کے
لیے غزلیں تیار کرتے رہتے ہیں تو آپ ہی بتائیے کہ آپ کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں؟
اس لیے ناکامی پر ناک بھوں چڑھانے کے بجائے اس بات کا جائزہ لیجیے کہ آپ
بار بار ناکام کیوں ہوتے ہیں - اگر ضمیر کہتا ہے کہ اس کام میں جسے دس سال سے
انجام دے رہے ہیں۔ ترقی کی گنجائش نہیں تو ایک لمحے کا توقف کیے بغیر اسے
چھوڑ دیجیے۔ بظاہر دس سال کے بعد نئی زندگی اور نیا کاروبار شروع کرنا احمقانہ فعل
دکھائی دیتا ہے۔ ممکن ہے دوست احباب اور متعلقین بھی مخالفت بلکہ اس تبدیلی پر
ملامت کریں لیکن ان ملامتوں کو برداشت کیجیے۔ یقین جانیے بالآخر یہ تبدیلی مفید
ثابت ہوگی اور آپ بہت جلد کامیابی کی اُس منزل تک پہنچ جائیں گے جہاں دس
سال میں نہ پہنچ سکے۔ پھر وہی لوگ جو اس تبدیلی پر انگشت نمائی کر رہے تھے آپ کے
مداح بن جائیں گے۔

ایک بار میں نے کسی دوست کی مدد سے ایک نوجوان کو جو ایم۔ اے کی ڈگری
رکھتا تھا، اچھا شاعر تھا، ایک اخبار میں بڑی دقتوں سے جگہ دلائی۔ ایک مہینہ گزرنے
پایا تھا کہ معلوم ہوا اخبار کے مینجر اس کی خدمات سے خوش نہیں۔ مالک عادی تھا

نیم تعلیم یافتہ افراد کو کم تنخواہ پر ملازم رکھ کر ان سے زیادہ کام لینے کا مگر مشاہرہ زیادہ دینا پڑتا تھا اور وہ کام تھوڑا لے سکتا تھا۔ ہم نے اس نوجوان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور مشورہ دیا کہ وہ صحافت کا خیال چھوڑ دے۔ یہاں پہلے ہی اتنے صحافی موجود ہیں کہ نئے آنے والوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ اس سے پہلے اسلامیہ کالج میں لیکچرر تھا۔ ہم نے مشورہ دیا کہ وہ پھر لیکچرر بن جائے مگر اس کا دل تعلیم و تعلم سے کھٹا ہو چکا تھا۔ کہنے لگا صحافی بننے کو جی چاہتا ہے۔ مگر دو چار مہینے ہی کی بیکاری کے بعد اس کا مزاج اعتدال پر آ گیا اور وہ ایک تجارتی ادارے میں ملازم ہو گیا۔ ابھی دو مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ ایک اور اخبار میں جگہ خالی ہوئی تو ہم نے اس کے لیے اس اخبار میں ملازمت کا بندوبست کیا اور اسے مطلع کیا تو صحافی بننے کے شائق نوجوان نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ وہ کہنے لگا کہ اب میں اس تجارتی ادارے کا اسسٹنٹ مینجر ہوں اور جس مشاہرے کی آپ پیشکش کر رہے ہیں اس سے ایک سو روپے ماہانہ زیادہ تنخواہ لے رہا ہوں۔ یہاں میرے لیے ترقی کی بڑی گنجائش ہے کیونکہ پروپرائٹر میرے کام سے خوش ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں ایک سال کے اندر اندر مینجر بنا دیا جاؤں گا۔ یہ نوجوان اگر صحافت کے پیچھے پڑا رہتا تو آج کسی اخبار میں مترجم ہوتا اور اردو اخبارات کے مترجمین کو جو تنخواہ ملتی ہے اس سے تن و روح کا رشتہ قائم رکھنا بھی دشوار ہے۔ اس واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اوقات انسان بے سوچے سمجھے یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ کس کام کے انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

میں ایسے متعدد نوجوانوں کو جانتا ہوں جنھیں با دلِ ناخواستہ کوئی محکمہ چھوڑنا پڑا۔ انھیں شروع شروع میں بڑا رنج ہوا لیکن آخر میں یہی تبدیلی کامیابی کا زینہ بن گئی۔

ہمارے ضلع کے صدر مقام میں ایک نوجوان کلرک تھا، بڑا اہلنس لکھ اور ہوشیار۔ ڈپٹی کمشنر نے اس کا تبادلہ کسی کے کہنے پر ایک تحصیل کے صدر مقام پر کردیا۔ کلرک وہاں جانے پر رضامند نہ تھا۔ اس نے ڈپٹی کمشنر تک سفارشیں پہنچائیں مگر بے سود۔ ڈپٹی کمشنر اس دھڑے کا طرفدار تھا جو اس کے تبادلے کے حق میں تھا۔ اس پر وہ نوجوان بڑا دل برداشتہ ہوا اور مستعفی ہو گیا۔ اس کا ایک رشتہ دار مشہور ٹھیکے دار تھا۔ اس نے کلرک کو اپنے پاس بلا لیا اور اس کلرک نے یہاں چند ہی سال میں اتنی ترقی کی کہ وہ مذکورہ ٹھیکے دار کے لاکھوں کے کاروبار کا نگرانِ اعلیٰ بن گیا۔ آج کل وہ اس ادارے کا تنخواہ دار ملازم نہیں بلکہ حصّہ دار ہے اور اس کی آمدنی کا اوسط اس ڈپٹی کمشنر کی تنخواہ سے دُگنا ہے جس نے اُسے دھڑا بندی کا شکار بنانا چاہا۔

میں ایک اور نوجوان کو جانتا ہوں جس نے تیرہ سال تک مدرس رہنے کے بعد اس پیشے کو خیرباد کہہ دیا۔ اب اس کی حیثیت معلمین سے تو کیا ڈسٹرکٹ انسپکٹروں سے بھی زیادہ اچھی ہے۔ ان نوجوانوں نے اپنے پیشے کو بادلِ ناخواستہ چھوڑا تو اس قدر ترقی کی۔ اگر وہ کسی مجبوری کے بغیر اس قسم کا اقدام کرتے یعنی یہ معلوم کرنے کے بعد کہ ان کے لیے کسی اور پیشے میں ترقی کی زیادہ گنجائش ہے، پہلا کاروبار چھوڑتے اور نئے میدان میں قسمت آزمائی کرتے تو نتائج اس سے بھی زیادہ حوصلہ افزا ہوتے۔

ڈر ہے کہیں کاروبار یا پیشے میں تبدیلی کو پست ہمت اور تساہل پسند نوجوان نظریہ سیحیات ہی نہ بنالیں، یا اپنی ناکامیوں کی ذمہ داری مصنف پر ڈال کر اطمینان حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اس لیے اس انتباہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ پیشہ،

کاروبار یا ملازمت میں تبدیلی صرف اسی صورت میں روا ہے جب کافی غور و خوض کے
بعد تبدیلی کا فیصلہ کیا جائے ۔ یہ نہ ہو کہ آپ دفتر جاتے ہیں، ہیڈ کلرک یا مینجر سے
معمولی بات پر جھڑپ ہو جاتی ہے، آپ فوراً استعفا داغ دیتے ہیں اور فیصلہ کر لیتے
ہیں کہ یہ ملازمت آپ کے لیے سود مند نہیں یا اگر آپ دکاندار ہیں اور بازار مندا ہونے
کی وجہ سے آپ کی دکان پر بھی گاہک نہیں آتے تو دکان بڑھا کر کسی اور شہر کا رخ کرتے
ہیں ۔ آپ کے ان عاجلانہ فیصلوں کی ذمہ داری آپ پر ہوگی ۔ یہ آوارگی تنزل کی طرف
لے جا سکتی ہے، ترقی کی طرف نہیں ۔ کامیابی سے تو اس کا دور کا بھی تعلق نہیں ۔ دنیا
میں کامیاب ہونے کے لیے عزم و ارادہ کی پختگی کے ساتھ ساتھ استقلال اور ان تھک
مساعی کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ناکامیوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ اور شکست کو
فتح کی بنیاد بنانے کی ہمت درکار ہوتی ہے، پھر ناکامیاں کامیابی کا پیش خیمہ ثابت
ہوتی ہیں ۔ بابر نے مسلسل جدوجہد اور استقلال کا سبق اس چیونٹی سے سیکھا جو ہر
ناکامی کے بعد نئے عزم اور حوصلے سے اپنے کام میں مصروف ہو جاتی تھی ۔
آپ بھی بابر کی طرح سوچیے کہ اگر ایک چیونٹی اپنے نصب العین کے لیے شکست
سے نہیں گھبراتی بلکہ ہر ہار کے بعد نئے عزم سے جیت کی کوشش کرتی ہے تو
آپ کیوں معمولی ناکامی پر حوصلہ ہار بیٹھیں اور آنسو بہانا شروع کر دیں ؟

کیا آپ نے کسی کامیاب انسان کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے کی تکلیف
گوارا کی ہے ؟ نہیں تو پھر مجھے کہنے کی اجازت دیجیے کہ آپ کامیابی کے متمنی ہی
نہیں ۔ کسی دانا کا قول ہے کہ بڑے آدمیوں کی زندگی وقت کی ریت پر نقشِ پا کی
حیثیت رکھتی ہے جسے دیکھ کر بعد میں آنے والے منزلِ مقصود کا نشان پاتے

ہیں۔ بڑے آدمیوں کے سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کامیابی کے مندر میں داخل ہونے کا راستہ کیونکر بنایا۔ انھیں راہ میں کس کس قسم کی مشکلات پیش آئیں وہ صہبائے ترقی کے کس قدر متوالے ہوتے تھے۔ وہ اپنی ناکامی کا الزام دوسروں کے سر تھوپ کر بری الذمہ ہونے کی کوشش نہ کرتے تھے۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر نہ بیٹھ جاتے تھے۔ وہ نہ بہانوں کی تلاش میں رہتے تھے، نہ معمولی ناکامی پہ اپنی جدوجہد کا رُخ کسی اور طرف موڑتے اور گلے شکوے کرتے تھے بلکہ "کوشش کرو پھر کوشش کرو، آگے بڑھو اور آگے بڑھو" کے اصول کے قائل تھے۔ یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔ اس لیے ان کے حالاتِ زندگی کا ضرور مطالعہ کیجیے۔ ان کی صحبت میں رہیے۔

پاکستانی نوجوانوں کے لیے قائدِ اعظم کی زندگی مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر وہ قائدِ اعظم کے نقشِ قدم پر چلیں تو دُنیا کی کوئی طاقت انھیں کامیابی سے محروم نہیں رکھ سکتی۔ وہ جس طرف مُنہ کریں گے فتح و نصرت کے فرشتے ان کے ساتھ ہوں گے اور ناکامیوں کے تاریک بادل چھٹ جائیں گے۔ قائدِ اعظم نے دولت حاصل کرنی چاہی تو اس مقصد میں کامیاب ہوئے۔ سیاسیات میں حصّہ لینا شروع کیا اور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں شامل ہوئے تو بہت جلد چوٹی کے لیڈروں کی صف میں جا بیٹھے اور جب ملّت کے منتشر اجزا کو پیوست کر کے مسلمانوں کو ایک علَم کے نیچے جمع کر کے پاکستان کا مطالبہ کیا تو پاکستان حاصل کر کے رہے۔

پاکستان حاصل کرنا بیسویں صدی کا بہت بڑا سیاسی معجزہ ہے۔ برطانیہ، ہندوستان کی مضبوط سیاسی جماعت کانگرس اور ہندوستان کے تمام بڑے بڑے

ہندو لیڈر پاکستان کے مخالف تھے۔ انھوں نے اس کی مخالفت کے لیے متحدہ محاذ بنایا۔ مہاتما گاندھی نے ملک کی تقسیم کو گائے ماتا کو تقسیم کرنے کے مترادف قرار دیا۔ لیکن کوئی سازش، کوئی محاذ، کوئی گٹھ جوڑ پاکستان کے قیام کو نہ روک سکا۔ اس دبلے پتلے وکیل نے اپنی زندگی کیونکر بنائی ؟ سات کروڑ مسلمانوں کو اکثریت کے چنگل سے کس طرح بچایا ؟ دنیا کی پانچویں بڑی اسلامی مملکت کس طرح سے قائم کی ؟ یہ کوئی ایسا راز نہیں جسے ہم نہ جانتے ہوں، پھر جب ہمارے سامنے کامیابی کی ایسی روشن مثال موجود ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ کراچی کے ایک متوسط درجے کے تاجر کا فرزند ارجمند اپنی خود اعتمادی، عزم صمیم، استقلال اور جدوجہد سے صرف اپنے خاندان کا نام ہی روشن نہیں کرتا بلکہ ایک قوم کی نجات کا وسیلہ بھی بنتا ہے تو ہم معمولی ناکامی پر مایوس کیوں ہوں ؟ ان نعمتوں سے جو قدرت نے ابنِ آدم کے لیے پیدا کی ہیں، بہرہ ور ہونے کی سعی کیوں نہ کریں ؟ یہ فیصلہ کیوں کرلیں کہ قدرت نے ہمارا نام ان لوگوں کی فہرست میں رکھا ہے جو ہر اچھی چیز سے محروم ہیں ؟

جب میں کہتا ہوں اپنا راستہ خود بنائیے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ دوسروں کی جائز امداد قبول کرنے سے انکار کردیں۔ آپ کی تبدیلی کسی دوسرے دفتر میں ہوگئی ہے۔ آپ کا اعلیٰ افسر کہتا ہے " مسٹر شریف! میں آپ کی خدمات اور تعاون سے بہت خوش ہوں۔ فرض کی بجا آوری کا جو عمدہ نمونہ آپ نے ہمارے دفتر کے کلرکوں کو دیا ہے میں اُسے سراہتا ہوں۔ میری دلی دعا ہے کہ آپ نئے دفتر میں جا کر ترقی حاصل کریں۔ یہ لیجیے آپ کی کارگزاری کا سرٹیفکیٹ " اس قسم

کے سرٹیفکیٹ بالعموم کام آیا کرتے ہیں۔ فرض کیجیے آپ کو نئے دفتر میں چارج لیے زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ اگلا گریڈ خالی ہو جاتا ہے۔ کیا اس صورت میں وہ سرٹیفکیٹ کام نہ آئے گا؟ مگر آپ سرٹیفکیٹ لینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اپنے افسر سے کہتے ہیں "آپ کی نوازش کا شکریہ مگر میں دوسروں کی امداد پر بھروسا نہیں کیا کرتا، رکھیے یہ سرٹیفکیٹ اپنے پاس" تو معاف کیجیے میں آپ کی قابلیت کے متعلق اچھی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ آپ اپنے آپ کو خود دار کہتے رہیں۔ آپ کے دوست آپ کا دماغ خراب کرنے کے لیے آپ کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں مگر میں تو یہی سمجھوں گا کہ آپ کے دماغ کی کوئی چول ضرور ڈھیلی ہے۔

افسر آپ کو عمدہ کارگزاری کا سرٹیفکیٹ دیتا ہے تو احسان نہیں کرتا بلکہ آپ کی خدمات کے عوض میں جائز امداد کرتا ہے بلکہ یوں کہیے ایک حقیقت کا اعتراف کرتا ہے! پھر اسے گناہ کیوں سمجھا جائے؟ اس پیشکش کو قبول کیوں نہ کیا جائے؟ دنیا کا کوئی انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ دوسروں کی امداد سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کر سکتا ہے۔ کسان آپ کے لیے اناج پیدا کرتا ہے، موچی جوتا تیار کرتا ہے، درزی کپڑے سیتا ہے اور آپ ان کی سہولت کے لیے باہر سے مال منگواتے ہیں۔ یوں سب ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ دنیا کا کاروبار امداد باہمی سے چلتا ہے، پھر کسی کی جائز امداد حاصل کرنے سے انکار کیوں کیا جائے؟

ہاں یہ صحیح ہے کہ ہر معاملے میں کسی کا سہارا ڈھونڈنا، ہر وقت کی سفارش کی تلاش معیوب ہے۔ آپ انعام کے مستحق نہیں مگر کوشش کرتے ہیں کہ کسی کی سفارش سے دوسرے کا حصہ آپ کو دے دیا جائے تو یہ ناانصافی ہے، ذلت ہے،

خودداری کے منافی ہے۔

جب آپ دیکھتے ہیں کہ اس دُنیا میں اکثر آدمی ہمت سے اپنا راستہ بناتے ہیں اور ترقی کی معراج تک پہنچ جاتے ہیں تو آپ بے دست و پا بن کر کیوں بیٹھے رہیں اور اس توقع پر وقت ضائع کریں کہ آپ کی راہ کوئی اور ہموار کرے گا؟

اگر کوئی اپاہج سہارا چاہے تو اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ سب اس سے ہمدردی کرتے ہیں لیکن تندرست آدمی بازار میں کھڑا ہو کر کہے "اے لوگو! یوں تو میں بھلا چنگا ہوں، جوان ہوں مگر مجھے سہارے کی خواہش ہے۔ میں عجائب گھر تک جانا چاہتا ہوں۔ وہ ہے تو اس جگہ سے صرف دو فرلانگ اور میں آسانی سے وہاں تک پیدل چل کر جا سکتا ہوں لیکن کون تنہا چلنے کی زحمت گوارا کرے اس لیے خدا کا کوئی بندہ آگے بڑھے اور مجھے عجائب گھر تک لے چلے۔" اگر آپ اس مجمع میں موجود ہوں گے جو اس کے گرد جمع ہے تو آپ فوراً فتویٰ دیں گے کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کوئی منچلا ''احمق'' کہنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ اسے دو چار رسید کر دے۔ لیکن تعجب ہے کہ آپ اس انسان کو ملامت نہیں کرتے جو دُنیا میں آگے بڑھنے کے لیے ہر وقت دوسروں کی طرف دیکھتا ہے، سفارش اور وسیلے کی تلاش میں رہتا ہے اور خود جد و جہد کر کے اپنا راستہ بنانے کی کوشش نہیں کرتا جب آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کامیابی کے مندر میں داخل ہونے کے لیے ہر انسان کو اپنا راستہ خود بنانا اور اپنا نصیبا خود جگانا پڑتا ہے۔

خیالات اور زندگی

۱۔ خیالات اور کامیابی

خیالات ہماری زندگی پر بڑا اثر ڈالتے ہیں۔ علمائے نفسیات کا کہنا ہے: "ہماری زندگی ہمارے خیالات کا پرتو ہے"۔ اگر ہم اپنے دل و دماغ کو کامیابی کے خیالات سے بسائیں گے تو کامیاب ہوں گے غم کے خیالات کا شکار بنیں گے تو غمگین بنیں گے۔ اگر ہمارے خیالات مسرت سے ناتا قائم کریں گے تو ہماری زندگی مسرور ہوگی۔ کامیابی اور خیالات میں گہرا رشتہ ہے۔ جو لوگ کسی کام کے شروع کرنے سے پہلے کامیابی کا یقین رکھتے ہیں بالعموم کامیاب ہوتے ہیں اور جن کے دماغ پر ناکامی کا بھوت سوار ہے انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کامیابی کے لیے جس جذبے اور جوش کی ضرورت ہوتی ہے وہ صرف اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب ہمیں کامیابی کا یقین ہو۔

ایمرسن کہتا ہے: "انسان جو کچھ سوچتا ہے وہی کچھ بنتا ہے"۔ ڈیل کارنیگی رقمطراز ہے: "ہمارا وجود ہمارے خیالات کا بنایا ہوا ہے اور ہماری تقدیر کا فیصلہ ہماری ذہنی کیفیت کے ہاتھ میں ہے"۔ ڈاکٹر ماڈرن فوت خیال کو تمام کامیابیوں کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "اگر آپ بامِ عروج پر پہنچنا چاہتے ہیں تو پہلے ذہنی طور پر اس بلندی تک پہنچیے یعنی تصور میں اپنی منزل مقصود

پر پہنچیے" ماروڈن کا یہ قول کس حد تک صداقت پر مبنی ہے؟ اس کے اندازے کے لیے "تاج محل" کی تعمیر پر غور کیجیے۔ خوبصورت "تاج محل" جسے ہماری آنکھیں دیکھ سکتی اور ہاتھ چھو سکتے ہیں، پہلے بنا یا وہ "تاج محل" جو انجینئر کے ذہن میں تھا؟ آپ مکان پہلے بناتے ہیں یا نقشہ پہلے تیار کرتے ہیں؟ اوسط درجے کی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی تسلیم کرے گا کہ نقشے پہلے تیار ہوتے ہیں۔ عمارتیں بعد میں بنتی ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کاغذی نقشوں سے پہلے ذہنی یا خیالی نقشے تیار ہوتے ہیں۔ انجینئر سب سے پہلے اپنے دماغ میں کسی عمارت کا نقشہ بناتا ہے۔ اس کے حسن و قبح پر غور کرتا ہے۔ احباب سے مبادلہ خیالات کرتا ہے جب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ مزید ترمیم و اصلاح کی گنجائش نہیں تو نقشہ نویس کو تفصیلات بتاتا ہے اور کاغذی نقشہ تیار ہونے پر دیکھتا ہے کہ وہ اس کے خیالی نقشے کے مطابق ہے یا نہیں۔

کامیابی کی عمارت کا نقشہ بھی پہلے ذہن میں تیار رہتا ہے۔ جو انسان اپنی زندگی بہتر بنانا چاہتا ہے، اپنی چھوٹی سی دکان کو وسیع کاروبار میں منتقل کرنے کا خواہاں ہے، کلرک کے بجائے افسر بننے کا متمنی ہے، کسی اخبار میں ساری عمر مترجم بنے رہنے پر قانع نہیں بلکہ مدیر اعلیٰ بننے کی تمنا رکھتا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی ذہنی کائنات میں انقلاب پیدا کرے، ذہنی گھٹیا ماحول کو خیرباد کہے اور تصور میں گہرائی سے بلندی تک پہنچنے کے مراحل طے کرے، اپنے آپ کو کامیاب انسان سمجھے اور ترقی کے اصول "ہر روز ایک قدم آگے" پر عمل پیرا ہو۔ یہی ہے وہ شاہراہ جو کامیابی کے مینار تک لے جاتی ہے۔

اگر آپ مجھ سے ایک ہزار بار بھی دریافت کریں گے کہ کامیابی کا سہل نسخہ بتلایئے تو میں ہر بار یہی کہوں گا کہ اپنے خیالات کی باگ صحیح رُخ کی طرف موڑیئے یعنی بلند خیال بنیے۔ اعلیٰ فضا میں پرواز کیجیے۔ اپنے آپ کو کامیاب انسان سمجھیے۔ ان افراد کے سوانح حیات کا مطالعہ کیجیے جو آپ کی طرح مفلس تھے جو آپ کی طرح تعلیم حاصل نہیں کر سکے جو معمولی مشاہرے پر کسی دفتر میں کلرک، فوج میں سائیس یا کسی مدرسے میں معمولی مدرس بھرتی ہوئے مگر آج جاہ و منصب رکھتے ہیں اور ان کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ سوچیے، اگر آپ جیسے بیسیوں مفلس لڑکے ترقی کر سکتے ہیں۔ لوگوں کی قسمت کے مالک، کارخانوں کے پروپرائٹر اور سرمایہ دار بن سکتے ہیں تو آپ کیوں کامیاب نہ ہوں؟ ان لوگوں کی ترقی کی کہانی پڑھنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی کامیابی بہت حد تک رہینِ منت ہے بلند خیالی اور خود اعتمادی کی۔ ان کے خیالات ہمیشہ ان سے ایک قدم آگے رہتے تھے اور انھیں اگلی منزل تک پہنچانے پر اکساتے تھے۔ جب وہ ایک معرکہ سر کر لیتے تھے تو رک نہ جاتے تھے، خیالات انھیں اور آگے چلنے پر مجبور کرتے تھے، اس لیے آگے بڑھتے تھے، یا لآخر وہ منزل پر پہنچ کے رہتے۔

بیسویں صدی مشاہیر کی صدی کہلاتی ہے۔ اس صدی میں بڑے بڑے مدبر، موجد اور سائنس دان پیدا ہوئے۔ اگر آپ ان کے حالاتِ زندگی بالتفصیل مطالعہ نہیں کر سکتے تو کم از کم یہ معلوم کرنے کی ضرور کوشش کیجیے کہ ان میں کتنے امراء کے فرزند ہیں کتنے کسی کالج یا یونیورسٹی کی سندِ فضیلت رکھتے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جنھیں اپنی زندگی خود بنانا پڑی۔ جن کا بچپن عسرت میں بسر ہوا اور جو مدتوں مزدوروں کی طرح

محنت و مشقت کر کے اپنے متعلقین کی امداد کرتے رہے۔ اگر ان مشاہیر میں اکثریت ان کی ہو جو گمنام گھرانوں میں پیدا ہوئے۔ جو اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے تو پھر غور کیجیے کہ آپ کیوں پست خیالی کے مریض بنیں اور اپنی زبوں حالی کو قسمت کا نوشتہ قرار دیں؟

"جب میں پیدائشی بدنصیب اور ازلی محروم ہوں۔ میری قسمت بُری ہے۔ خدا کی رضا یہی ہے کہ میں اچھی چیزوں سے محروم رہوں پھر جد و جہد سے کیا فائدہ؟ پچھلے سال میں نے سوختنی لکڑی کا کاروبار کر کے دیکھ لیا ہے کہ خدا مجھے کامیاب نہیں دیکھنا چاہتا۔ مجھ سے کم سرمایے پر کاروبار کرنے والوں کو نفع ہوا مگر میں خسارے میں رہا۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ دولت میری قسمت میں نہیں؟ میں فی الواقع بدنصیب ہوں اور قسمت کے خلاف جنگ بالکل بے سود ہے۔ تقدیر نہیں بدلی جا سکتی۔" اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کے خیالات رکھنے والا انسان ترقی کر سکتا ہے تو آپ کی حالت قابلِ رحم ہے۔ ایسے انسان کو ترقی کا ہر روز نیا موقع ملے، دولت اس کے دروازے پر آ کر دستک دے جب بھی اس کی حالت نہ سدھرے گی۔ وہ ہمیشہ مفلوک الحال رہے گا کیونکہ وہ فطرت کے قوانین کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ جب اس کے خیالات جا رہے ہیں پستی کی طرف تو وہ بلندی تک کیونکر پہنچ سکتا ہے؟

قدرت نے انسان کو بدنصیب پیدا نہیں کیا۔ اگر اس نے آپ کو بھی ابراہیم لنکن، نپولین، فرنکلن، ڈسرائیلی اور اسٹالن کی طرح دو ہاتھ، دو پاؤں، دو آنکھیں اور تندرستی عطا کی ہے تو پھر آپ انھیں کی طرح اپنا راستہ خود کیوں نہ بنائیں؟

قدرت اُن پر مہربان تھی تو آپ سے کیوں ناراض ہو؟ قدرت جانب دار نہیں۔ اس لیے معلوم کرنے کی کوشش کیجیے کہ ان کی کامیابی کا راز کیا ہے اور جب آپ کو معلوم ہو جائے کہ وہ کیونکر کامیاب ہوئے تو ان کی طرح بلند خیالی کو شعار بنائیے۔ بحرِ حیات کی طوفانی موجوں سے لڑیے اور ترقی کی معراج تک پہنچیے۔

سوچیے کہ اگر وہ شکست سے فتح کا پہلو نکال سکتے اور شکست کو فتح سے بدل سکتے ہیں تو آپ کیوں پہلی ناکامی پر ہتھیار ڈال دیں؟ مفلوج بن کر بیٹھ جائیں، راک فیلر فورڈ اور کارنیگی کی طرح پھر کیوں کوشش نہ کریں؟ اور اپنے معمولی کاروبار کو عظیم کاروبار میں منتقل نہ کریں؟ اگر محمد غوری پہلی شکست پر مایوس ہو جاتا اور اس کے ماتم میں ساری عمر بسر کر دیتا تو ہندوستان میں مسلمان شاید ہی صدہا سال تک حکومت کرتے۔ اگر ابراہیم لنکن جنوبی ریاستوں کی بغاوت کے ڈر سے اصول کی قربانی پر آمادہ ہو جاتا تو ریاست ہائے متحدہ کو عظمت حاصل نہ ہوتی۔

قائدِ اعظم کی جد و جہد پر غور کیجیے۔ کیا انھیں ناکامیوں کا منہ نہ دیکھنا پڑا؟ قائدِ اعظم نے پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے بلکہ اُس کے تخیل سے برسوں پیشتر مسلمانوں کے مطالبات کی فہرست حکومتِ برطانیہ اور انڈین نیشنل کانگرس کے سامنے پیش کی مگر اُسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا گیا۔ کیا قائدِ اعظم نے ہتھیار ڈال دیے اور حریفوں سے کہہ دیا کہ "اچھا جناب آپ ہمارے مطالبات نہیں مانتے تو ہم خاموش ہو جاتے ہیں۔ آپ طاقتور ہیں، منظم ہیں، آپ کے پاس حکومت ہے، روپیہ ہے، ہم ان سب سے محروم ہیں اس لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اپنے مستقبل کو آپ کے حوالے کر دیں اور راضی برضا ہو جائیں۔ ہاں آپ سے اتنی درخواست ضرور

ہے کہ اپنے خوانِ کرم سے ہمارے کشکول گدائی میں چند ٹکڑے ڈال دیجیے؟ کیا قائدِ اعظم نے مسلمانوں کے موت کے وارنٹ پر محض اس لیے دستخط کرنے پر آمادگی ظاہر کردی کہ حریف طاقت والا ہے؟ نہیں! قائدِ اعظم نے مجاہدانہ عزم سے کام لے کر علامہ اقبال کی تجویز "مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن" کو مسلم لیگ کا نصب العین بنا دیا اور شدید مخالفت کے باوجود پاکستان بنوا کر دم لیا۔

آپ بھی اپنی شکست کو فتح میں بدل سکتے ہیں مگر پست خیالی کا شکار بن کر نہیں۔ اس لیے اس جہنم سے باہر نکلیے۔ اپنے آپ کو بدقسمت نہ سمجھیے، خدا پر بھروسا کیجیے، وہ مہربان ہے، کارساز ہے، ناکامیوں کو کامیابیوں میں بدل سکتا ہے، وہ آپ کو محنت کا بدلہ ضرور دے گا۔

ہماری دنیا میں اس قسم کے افراد موجود ہیں جنھوں نے ظاہری بدقسمتی کو خوش نصیبی میں بدل لیا۔ ڈیل کارنیگی ایک ایسے نوجوان کے حالات تفصیل سے بیان کرتا ہے جس کی دونوں ٹانگیں چوبیس برس کی عمر میں بیکار ہو گئیں۔ وہ پہیوں والی گاڑی پر بیٹھ کر اِدھر اُدھر جا سکتا تھا۔ اس نوجوان کو قسمت کی شکایت کرنے کا حق حاصل تھا۔ وہ آسمان سر پہ اٹھا لیتا، رونا دھونا پیشہ بنا لیتا تو سب اُسے حق بجانب سمجھتے اور کچھ عرصے تک وہ قسمت کو بُرا بھلا بھی کہتا رہا۔ لیکن اس نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ اس بدنصیبی کو خوش نصیبی میں بدلا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد قسمت کا گلہ کرنے کے بجائے اس نے اپنا وقت کتابوں کے مطالعے میں صرف کیا۔ مطالعے نے اس کی آنکھیں کھول دیں اور اس نے اتنی استعداد بہم پہنچا لی کہ سیاسی مسائل پر دوسروں سے مبادلۂ خیالات کرنے میں جھجک محسوس نہ کرتا۔ چند سال بعد اس نے پہیوں والی

کرسی پر بیٹھ کر حالات حاضرہ پر تقریروں کی مہم شروع کر دی اور جب عوام پر اُس کی سیاسی بصیرت کا سکہ بیٹھ گیا تو انھوں نے اُس کی قدر کی اور اسے اپنا نمائندہ بنانے پر آمادہ ہو گئے۔ آخر کار پہیتوں والی کرسی پر بیٹھ کر تقریریں کرنے والا بین مورسٹن ریاست جارجیا کا سکریٹری آف سٹیٹ بنا۔

ملٹن اور ہیلن کیلر کے متعلق تو آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ بظاہر محروم القسمت تھے۔ اوّل الذکر اندھا تھا مگر اس نے شاعری میں کمال حاصل کیا اور آخر الذکر خاتون اندھی ہونے کے علاوہ گونگی اور بہری بھی تھی مگر یہ جسمانی عیوب اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے باز نہ رکھ سکے۔ ملٹن، مورسٹن اور ہیلن کیلر نے برائی کو بھلائی میں بدل لا تو اعلیٰ خیالات کو اپنا کر۔ اگر وہ شکست اور بد قسمتی کے خیالات کا شکار بن جاتے تو وہ بھی اندھے اور معذور گداگروں کی قطار میں بیٹھے بابا ایک پیسہ کی صدا بلند کرتے۔ غور کیجیے اگر اس قسم کے انسان بد قسمتی کو خوش قسمتی میں بدل سکتے ہیں تو آپ کیوں غم والم کا شکار ہو جائیں اور معمولی ناکامی کو وقعت دے کر رائی کو پہاڑ سمجھتے ہوئے اپنی زندگی برباد کر لیں؟

آپ شیخ چلی نہیں بننا چاہتے تو ہرگز نہ بنیے۔ میرا کہنا بھی یہی ہے کہ پہلے ہوائی قلعے بنا لیجیے پھر اُن کی بنیادیں زمین پر رکھیے۔ اپنے آپ کو بد قسمت نہ سمجھیے۔ یہ نہ کہیے کہ قدرت آپ کو ترقی کرتے نہیں دیکھ سکتی۔ ہمیشہ اچھی چیزوں کے متعلق سوچیے اور انھیں حاصل کرنے کی جدّوجہد کیجیے۔ اسے شیخ چلی بننا نہیں کہتے البتہ وہ لوگ ضرور ناکام ہوتے ہیں جو ہوائی محل تو تعمیر کرتے رہتے ہیں مگر ان کی بنیادیں رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

ترقی کے خیالات نفع بخش ہیں۔ اُن لوگوں کے لیے جو باہمت ہوتے ہیں

پست خیال آدمی کبھی ترقی کے لیے جد و جہد نہیں کرتا۔ وہ کسی دفتر میں کلرک بھرتی ہوتا ہے تو کلرک ہی ریٹائر ہوتا ہے۔ مگر بلند خیال اور بلند ہمت کلرک ذمہ داری کے عہدے سنبھالتے ہیں۔ گرانقدر مشاہرے لینے والے اکثر سکرٹری کلرک بھرتی ہوئے تھے۔ انھوں نے ترقی حاصل کرنے کا عہد کیا، اس کے لیے جد و جہد کی، وہ جمود کے قائل نہ تھے اس لیے ترقی کے مستحق قرار دیے گئے۔

میں بعض ایسے نوجوانوں کو جانتا ہوں جنھوں نے ٹائپ اور شارٹ ہینڈ پر پوری طرح دسترس حاصل کی اور اپنے اس ہنر کی بنا پر معقول مشاہرے لے رہے ہیں۔ ان میں سے ایک دو کا ذکر اس لیے کرتا ہوں کہ وہ نوجوان جو سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں کلرک بھرتی ہوئے ہیں محسوس کریں کہ ان کے لیے ترقی کی کس قدر گنجائش ہے۔

کراچی کے ایک دفتر میں ایک سٹینوگرافر کام کرتا ہے۔ اسے سات سو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے اس لیے کہ اسے ٹائپنگ میں مہارت تامہ ہے۔ وہ شارٹ ہینڈ سے مدد لینے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ادھر افسر کے منہ سے الفاظ نکلتے ہیں، ادھر وہ انھیں ٹائپ کر لیتا ہے۔ ادھر افسر نے بولنا ختم کیا اور ادھر چھٹی تیار ہوتی ہے۔ اسے اپنے صحیح ٹائپ کرنے پر اس قدر اعتماد ہے کہ وہ نظر ثانی کیے بغیر ہی چھٹی افسر کے سامنے رکھ دیتا ہے اور افسر بھی تامل کیے بغیر اس پر دستخط کر دیتا ہے۔

یہ گرانقدر مشاہرہ ایک کلرک کو ملتا ہے۔ دوسروں کے الفاظ ٹائپ کرنے والے کلرک کو اور اس میں تعجب کی بات ہی کیا ہے۔ دو سال ہوئے میں نے ایک

روزنامے میں "ضرورت ہے" کے کالم میں ایک تجارتی ادارے کی طرف سے ایک اشتہار دیکھا جس میں ایک سٹینوگرافر کی خدمات ساڑھے سات سو روپے پر طلب کی گئی تھیں۔ پچیس روپے روزانہ اُجرت پہ۔ میں ان دنوں اس روزنامے کا مطالعہ بڑی باقاعدگی سے کیا کرتا تھا۔ دوسرے دن بھی اس اشتہار میں کسی قسم کی تصحیح نہ کی گئی تھی یعنی تجارتی ادارے کو فی الواقع ایک ایسے سٹینوگرافر کی خدمات درکار تھیں جسے سات سو پچاس روپے ماہانہ تنخواہ دی جائے گی۔

میرا ایک دوست پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے دو سال پہلے ایک فوجی ادارے میں اسسٹنٹ سکریٹری تھا اور دو سو روپے ماہوار مشاہرہ لیا کرتا تھا۔ وہ ٹائپ رائٹنگ اور خط و کتابت میں اچھی دسترس رکھتا ہے۔ اس کا علم مجھے اُس وقت ہوا جب پاکستان بننے کے ایک سال بعد میں اُسے کراچی میں ملا۔ اس وقت اس نے درآمد و برآمد کا کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ وہ اپنے دفتر میں خود ہی افسر تھا اور خود ہی ٹائپسٹ۔ وہ خود ہی ڈاک بھیجنے کی ترسیل کا ذمہ دار تھا۔ ایک روز میں دیر تک اُس کے دفتر میں بیٹھا رہا۔ وہ میری موجودگی میں آدھ گھنٹے تک ایک طویل مکتوب کسی غیر ملکی فرم کے نام ٹائپ کرتا رہا۔ اس دوران میں مجھ سے گپ شپ بھی رہی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ٹائپ کی ایک مشین گھر پہ بھی رکھی ہے۔ جس پر وہ رات کو ٹائپ کرتا ہے۔ میں اس کی جفاکشی پر اسے داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

چھ مہینے بعد مجھے ایک بار پھر اس کے دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اب کے دفتر کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ اسی دفتر میں جہاں میرا دوست خود ہی سب کچھ تھا۔ چھ

کلرک اور ایک سکریٹری کام میں مصروف تھے۔ دفتر کے باہر ایک نئی موٹر کار کھڑی تھی میرا دوست کہنے لگا۔ یہ موٹر اس نے ابھی ابھی خریدی ہے۔ کلب جلتے وقت تکلیف ہوا کرتی تھی۔

ہمارے ملک میں وہ نوجوان جو اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے، بالعموم میٹریکولیشن کا امتحان پاس کر کے دفتر میں کلرک بھرتی ہوتے ہیں۔ اُن میں سے اکثر قابلِ ذکر ترقی کیے بغیر ملازمت کی میعاد پوری کرتے ہیں۔ ترقی سے دلچسپی نہ رکھنے اور اپنی تعلیمی کمی کو پورا نہ کرنے والے یہ نوجوان شکووں کا دفتر دراز کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں، وہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے یونین بناتے ہیں، اخباروں میں اپنی بے بسی اور کم مایگی کا رونا روتے ہیں۔ اور تخفیف کے مواقع پر ہڑتال کی دھمکی دیتے ہیں اور انھیں اس کا حق حاصل ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ وہ حقوق طلبی کے ساتھ ساتھ اپنی قابلیت میں اضافہ کریں جنھیں ٹائپ رائٹنگ اور شارٹ ہینڈ سے دلچسپی ہے وہ ان میں استعداد بڑھائیں جو اکاؤنٹ برانچ میں کام کرتے ہیں وہ اچھے اکاؤنٹنٹ بننے کی کوشش کریں اور جو علمی مذاق رکھتے ہیں وہ اعلیٰ امتحانات پاس کر سکتے ہیں۔ یوں وہ 'اپنی مدد آپ' کر کے ترقی حاصل کر سکتے ہیں۔

خیالات کی رفعت انفرادی ترقی ہی کے لیے ممد ثابت نہیں ہوتی بلکہ انسانیت کی بہبود اور اقوام و ملل کی تقدیر بدلنے میں بھی اہم حصہ ادا کرتی ہے۔ ہماری دنیا کی ترقی، یہ ایجادیں جن سے ہم فائدہ حاصل کر رہے ہیں، نتیجہ ہیں چند انسانوں کی بلند خیالی کا۔ آج ہم بے تار پیام رسانی سے فائدہ اٹھا رہے

ہیں۔ ہمارے گھر بجلی کے قمقموں سے روشن ہیں۔ ہم گھر بیٹھے دنیا جہان کے حالات سے باخبر رہتے ہیں تو اس کے لیے ہم ممنون ہیں ان موجدوں کے تخیلات کے جنھوں نے نوعِ انسان کی بھلائی کی خاطر برسوں خیالی گھوڑے دوڑائے۔ آج ہماری دنیا پہلے کی نسبت زیادہ خوب صورت ہے۔ جہالت کا اندھیرا دُور ہو رہا ہے۔ ہم قحط، وباؤں اور بیماریوں کا مقابلہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ آج دنیا کی طنابیں کھچی نظر آتی ہیں۔ تو یہ کرشمے بھی خیالات ہی کے ہیں۔ ہمارے سائنس دانوں، فلاسفروں، جغرافیہ دانوں اور علماء نے ان کے متعلق سوچا، برسوں ان ایجادات اور اختراعات کے متعلق خیالی قلعے بناتے رہے، جب کہیں ہمیں یہ نعمتیں حاصل ہوئیں۔

پاکستان کے نوجوان اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ سرزمین جس میں وہ آج آزادانہ زندگی بسر کر رہے ہیں اور جسے مثالی ریاست بنانے کا خواب دیکھ رہے ہیں، ایک فلاسفر، ایک شاعر کے تخیل کا نتیجہ ہے۔ اگر علامہ اقبال آج سے بیس برس پہلے اسلامیانِ ہند کے سامنے اپنا خواب اور خیال پیش نہ کرتے۔ اگر وہ مستقبل کے پردوں سے جھانک کر شمال مغربی اور مشرقی ہندوستان میں آزاد اسلامی ریاست نہ دیکھ لیتے اور بھری محفل میں نہ کہتے کہ "یہ اسلامی مملکت مسلمانوں کی قسمت میں لکھی جا چکی ہے" تو مسلمان شاید ہی بنگال اور پنجاب میں چھپن فی صد اور مرکز میں ایک تہائی نشستوں کے مطالبے کے طلسم سے نکل سکتے۔

گو پاکستان ۱۹۴۷ء میں حاصل کیا گیا اور مسلم لیگ نے قرار داد آزادی

سنہ ۱۹۴۰ء میں منظور کی لیکن حق یہ ہے کہ پاکستان کا سنگِ بنیاد سنہ ۱۹۳۰ء ہی میں رکھ دیا گیا تھا جب علامہ اقبال نے الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کو خطاب کرتے وقت اعلان کیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی زیست کا حقوق کے تحفظ کے معاہدے نہیں بلکہ آزاد اسلامی مملکت کا قیام ہے۔ حضرت علامہ کے اس خیال کو شروع شروع میں شاعر کا خواب اور مجذوب کی بڑ قرار دیا گیا۔ بنگالیوں کو تو اس کا مضحکہ اڑانا ہی تھا۔ انہوں نے بھی قدر نہ کی۔ ان مسلمانوں نے جو قوم پرست کہلاتے تھے اور اپنے آپ کو اس لیے با عمل سمجھتے تھے کہ وہ گاندھی ٹوپی پہنتے اور کانگرسی لیڈروں کے ساتھ گرفتار ہو کر جیل یاترا کرتے تھے ۔ بے عمل شاعر کے اس خیال کو ایسا خواب قرار دیا جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا لیکن سترہ سال کی قلیل مدت میں وہی خواب، شاعر کا تخیل، حقیقت بن کر دنیا کے سامنے جلوہ گر ہوا۔

ہمارے وطن کا نام " پاکستان " ایک اور خیال پرست نے تجویز کیا۔ دنیا میں شاید ہی کسی ملک کا نام اتنا مقدس اور پیارا ہو۔ پاکستان پاک لوگوں کی سرزمین یا ملک جہاں پاکیزہ خیالات کے لوگ بستے ہیں۔ اگر چودھری رحمت علی تخیلات کی دنیا میں پرواز نہ کرتے اور آزادی ملنے کے بعد ہمیں اپنے وطن کا نام تجویز کرنا پڑتا تو شاید ہی ہم اتنا شاندار نام تجویز کر سکتے۔

ملکوں کے نئے نام رکھنا سہل نہیں۔ ثبوت کے لیے پنجاب اور بنگال کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ پنجاب دو حصوں میں تقسیم ہوا مگر نہ مشرقی پنجاب والے اپنے دیس کے لیے پنجاب سے زیادہ اچھا نام دریافت کر سکے، نہ ہمیں کو حوصلہ ہوا۔

یہی صورت بنگال میں پیش آئی۔ ہم اپنے بنگال کو مشرقی بنگال کہتے ہیں اور ہندوستان والے اپنے حصے کو مغربی بنگال۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ایسا نام تجویز کرنا جو موزون بھی ہو اور فوراً مقبول بھی ہو سکے، آسان نہیں۔ ذرا سوچیے تو سہی اگر چودھری رحمت علی کا تخیل ہماری رہنمائی نہ کرتا۔ اگر ہمارے ذہن لفظ پاکستان سے مانوس نہ ہوتے تو ہم اپنے ملک کو کس نام سے یاد کرتے؟ کاغذ پنسل لیجیے اور درجن بھر نام لکھیے سب سے آخر میں چودھری رحمت علی کا تجویز کردہ نام لکھیے اور ان میں مقابلہ کیجیے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ خیال پرست چودھری کے کارنامے کو ضرور سراہیں گے۔

۲- خیالات اور مسرّت

اعلیٰ خیالات کامیابی کا زینہ ہیں تو مسرّت کے خیالات زندگی کو مسرور بنانے اور ہمیں کامیابی کے لیے جدوجہد کے قابل بنانے کا وسیلہ۔ خوش رہنے کی عادت ہمیں اس قابل بناتی ہے کہ ہم زندگی کی تلخیوں اور دشواریوں کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کریں۔ اس عادت کا ہماری زندگی پر بڑا خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ آپ دفتر سے تھکے ماندے گھر آتے ہیں۔ آپ کی بیوی آپ کا خیر مقدم ہلکی سی مسکراہٹ سے کرتی ہے۔ یہ مسکراہٹ جس میں محبت اور خلوص سمویا ہوا ہے اور ننھی بچّی خوش آمدید ابّاجان، کہہ کر آپ سے لپٹ جاتی ہے تو سچ کہیے کیا آپ دن بھر کی کلفت بھول نہ جائیں گے؟ اور اگر بدقسمتی سے آپ کی شریکِ حیات فلسفۂ مسرّت سے آشنا نہیں، ہر وقت مُنہ پھلائے رکھتی ہے، آپ دن بھر کی مشقت کے بعد گھر لوٹتے ہیں تو آپ کا استقبال رنج و بیزاری کی گھٹاؤں سے کیا جاتا ہے، آپ راحت اور سکون چاہتے ہیں مگر گھر کی مالکہ شکایات کا دفتر کھول دیتی ہے، بات بات پر "آگ لگے اس گھر کو، کہاں میری قسمت پھوٹی"۔ اگر ایک خادمہ رکھنے کی توفیق نہ تھی تو مجھے بیاہ کیوں لائے؟ ابھی بچّوں کے کپڑے دھو کر فارغ نہ ہوئی تھی کہ صاحب بہادر کی چائے کا وقت ہو گیا ہے۔ نہ دن کو آرام نہ رات کو چین، "ہونہہ"۔ یہ تقریر سن کر آپ کے دل پر کیا گزرے گی؟ کیا آپ گھر سے بیزار نہ ہو جائیں گے؟

اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو انصاف سے کہیے کہ دوستوں سے ملتے وقت آپ کا مُنہ لٹکانا اور مجسمۂ غم بننا کہاں تک روا ہے؟ آپ کو دل شکستہ دیکھ کر ان پر کیا اثر ہوگا؟ کیا وہ آپ سے پہلو بچانا نہ چاہیں گے؟ آپ سے بچ کر رہنے کی کوشش نہ کریں گے؟ آپ سے ملتے ہوئے کلفت محسوس نہ کریں گے؟ اگر آپ کو سوگوار رہنے کی عادت ہے، آپ کا افسر کسی اہم معاملے میں آپ کا مشورہ چاہتا ہے مگر آپ خود غم و الم کا شکار رہیں تو مشورہ کیا خاک دے سکیں گے؟ اور اگر بفرضِ محال آپ مشورہ دینے کے قابل ہوں بھی تو آپ کی صورت دیکھ کر وہ کبیدہ خاطر نہ ہوگا؟ اور ایسی دو چار ملاقاتوں کے بعد آپ سے نجات حاصل کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے گا؟

جب ہمیں اس دنیا میں رہنے کی مہلت مختصر عرصے کے لیے دی گئی ہے تو اُسے روتے ہوئے بسر کرنا کہاں کی دانش مندی ہے اس لیے خوش رہیے۔ ہر حال میں، ہر موسم میں خوش رہیے۔ دفتر میں، گھر میں خوش رہیے۔ کسی پارٹی میں شامل ہوں، کسی کلب گھر یا کسی ناچ گھر میں جائیں تو چہرے پر مسرّت کے آثار پیدا کیجیے اور جب بے تکلف دوستوں میں بیٹھے تو قہقہے لگائیے۔ زندگی کی کلفتوں کو قہقہوں میں گم کر دیجیے تاکہ آپ تازہ دم ہو کر زندگی کی جد و جہد میں حصّہ لے سکیں اور کامیابی حاصل کر سکیں۔

مانا کہ آپ کو مالی نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔ آپ کی زندگی بھر کی پونجی چور لے گئے ہیں۔ اب آپ بچّی کی شادی کریں تو کیونکر؟ یہ صدمہ ایسا نہیں جو آسانی سے برداشت کیا جا سکے لیکن یہ تو بتائیے کہ آنسو بہانے سے آپ کو کیا مل جائے گا؟ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کو روتے دیکھ کر آپ کے رشتہ دار اور دوست امداد پر

آمادہ ہو جائیں گے تو بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں - ایسے عزیز اور قریبی رشتہ دار نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں - پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ کے اعزہ امداد کرنے کی استطاعت رکھتے ہوں - اس بات کا بھی تو احتمال ہے کہ وہ مدد تو کر سکتے ہوں مگر عین اسی وقت جب آپ کی ناؤ ڈوب رہی ہے خود ان کا سفینہ خطرات کی چٹانوں سے ٹکرا رہا ہو - پھر بسورنے سے فائدہ؟

مالی نقصان پر بے حد رنجیدہ ہونے سے مالی ساکھ خواہ مخواہ بگڑتی ہے - آپ کو روتے دیکھ کر وہ مالی مدد دینے سے ہچکچائیں گے - وہ سمجھیں گے کہ آپ تباہ و برباد ہو چکے ہیں - آپ کو روپیہ دینا ضائع کرنا ہے اس لیے ٹال مٹول سے کام لیں گے - "میں آپ کی مدد ضرور کرتا لیکن اس مہینے حج کے لیے جا رہا ہوں ٹکٹ بھی خرید لیا ہے" دوسرا کہے گا: "آپ کی امداد میرا فرض ہے لیکن کیا کروں مجبور ہوں - میں نے پچھلے مہینے سارا سرمایہ گڑ کے کاروبار میں لگا دیا ہے جب رقم وصول ہو گی تو ضرور مدد کروں گا" اور یہ مجبوریاں تقریباً تمام دوستوں اور رشتہ داروں کو اسی وقت لاحق ہوں گی جب آپ مدد چاہیں گے - اس کے برعکس اگر آپ صدمے سے نڈھال ہونے کے باوجود حوصلہ قائم رکھیں گے مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے، جب کوئی رشتہ دار یا دوست اس حادثے پر اظہار افسوس کرے گا تو آپ اس پر ظاہر نہ ہونے دیں گے کہ آپ سب کچھ کھو چکے ہیں اور کنگال بن چکے ہیں، آپ ان کی ہمدردی کا شکریہ ادا کریں گے لیکن آپ کے الفاظ سے یہ ظاہر نہ ہونے پائے گا کہ آپ ختم ہو چکے ہیں تو سمجھیے کہ آپ نے میدان مار لیا ہے آپ کی خود اعتمادی کا ان پر بڑا خوشگوار اثر ہو گا - وہ سمجھیں گے کہ آپ کے پاس

ابھی بہت کچھ ہے۔ آپ کسی کی امداد کے محتاج نہیں۔ پھر وہ ہمدردی ظاہر کرنے کا مؤثر طریق اختیار کرنے پہ آمادہ ہو جائیں تو بعید از امکان نہیں۔ اعزہ میں سے کچھ ایسے ضرور نکل آئیں گے جو از خود مالی امداد کی پیشکش کریں گے، کہیں گے: "گو خدا کا فضل آپ کے شامل حال ہے اور یہ حادثہ آپ کے لیے بالکل معمولی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ اور روپے کی احتیاج؟ خدا نہ کرے لیکن یہ لیجیے تھوڑے سے روپے۔ ان سے فوری ضرورت پوری کیجیے۔ جب بنک سے روپیہ نکلوائیں گے تو واپس کر دیجیے گا۔ دیکھیے انکار نہ کیجیے۔ آپ مجھے غیر کیوں سمجھتے ہیں؟" یہ ہوں گے ان کے جذبات۔ یہ ابرِ کرم کیوں برس رہا ہے؟ صرف اس لیے کہ آپ نے شکست قبول نہیں کی۔

اگر آپ اس لیے غمگین ہیں، آپ نے ماتمی حلیہ بنا رکھا ہے کہ مقابلے کے امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکے، آپ کے ایک سال کی محنت اکارت گئی، آپ ترقی کا یہ حسین خواب دیکھ رہے تھے وہ شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا تو آپ کا رنجیدہ ہونا کسی حد تک حق بجانب سہی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ عضو ہاتھ بچھا لیں۔ دفتر کا کام چھوڑ دیں، ماتحتوں پر غصہ نکالیں، بیوی سے لڑیں اور بچوں پہ سختی کریں۔ اگر یہ جوار بھاٹا آپ کے لیے مفید ثابت ہو سکتا تو میں آپ کو اس سے احتراز کا مشورہ کبھی نہ دیتا مگر میں جانتا ہوں کہ یہ جھنجھلاہٹ آپ کے لیے مضرت رساں ہے۔ اگر آپ اپنا کام مستعدی سے نہ کریں گے تو اس بات کا احتمال ہے کہ آپ کو ملازمت سے جواب دے دیا جائے یا اعلیٰ افسر کسی دن سب کے سامنے فہمائش کرے۔ ماتحتوں سے بات بات پہ لڑیں گے تو اپنا وقار کھوئیں گے۔ بیوی سے لڑ کر

اپنی گھریلو زندگی کو عذابِ الیم بنائیں گے اور بچوں پر غصہ نکالنے کا آپ کو حق ہی کیا ہے؟ ان معصوم فرشتوں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟ بتائیے اس قربانی کا آپ کو کیا صلہ ملے گا؟ غالباً کچھ نہیں تو پھر کیا یہ سودا خسارے کا نہیں؟

آپ نے یاس اور غم کے خیالات کو اپنے دل و دماغ پر حکومت کرنے کی اجازت دے کر کچھ حاصل تو نہیں کیا مگر کھو یا بہت کچھ۔ پھر آپ ان سے بچ کر کیوں نہ رہیں؟ سوچیں کہ اب کے کامیاب نہیں ہو سکے تو کونسی قیامت آگئی ہے۔ آئندہ سال بھی۔ اس کے بعد اپنی ناکامی کے اسباب و علل معلوم کیجیے اور عزم صمیم سے کامیاب ہونے کے لیے محنت شروع کر دیجیے۔ ابھی سے؟ جی ہاں کیا آپ نے سنا نہیں سست رفتار کچھوا تیز رفتار خرگوش سے بازی لے جاتا ہے۔ ابھی سے مطالعہ شروع کر دیں گے تو کامیابی یقینی ہو جائے گی۔ آپ کو یہ شکایت نہ رہے گی کہ امتحان کی تیاری کے لیے وقت نہ مل سکا مگر تیاری سے بھی پہلے مایوسی کے خیالات سے نجات حاصل کیجیے کیونکہ ناامیدی دل کو بجھا دیتی ہے اور کام کرنے کے قابل نہیں رہنے دیتی۔

جب ڈیل کارنیگی سے دریافت کیا گیا کہ اس نے زندگی میں سب سے بڑا سبق کیا حاصل کیا ہے تو اس نے جواب دیا "میرے لیے زندگی میں سب سے زیادہ موثر سبق انسانی خیالات کی اہمیت کا احساس تھا"۔ ڈیل کارنیگی کا مطلب یہ ہے۔ کہ خیالات انسانی زندگی پر بہت اثر ڈالتے ہیں۔ وہ ہماری زندگی کو بہتر بھی بنا سکتے ہیں اور بدتر بھی۔ اگر ہم مسرت، کامیابی، دوستی اور بھلائی کے خیالات اپنائیں گے تو کامیاب ہوں گے اور اگر خوف، ناکامی اور بیماری کے تصور میں ہمیشہ غرق رہیں گے

تو مسرّت اور کامیابی کی جھلک بھی نہ دیکھ پائیں گے۔ اس لیے فائدے میں وہی لوگ رہتے ہیں جو مسرّت اور کامیابی کے خیالات سے رابطہ قائم رکھتے ہیں۔

مسرّت مادی چیز نہیں کہ بازار سے خریدی جاسکے۔ اگر یہ دکانوں سے مل سکتی تو امرا اپنے خزانے لٹا کر بھی اسے اپنی تجوریوں میں جمع کر لیتے اور ہمیشہ خوش رہتے۔ روپے پیسے سے موٹریں، کوٹھیاں اور سامانِ تعیش خریدا جا سکتا ہے، خوشی نہیں، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ بیشتر امرا سوء ہضم، بے خوابی اور اسی نوع کے دوسرے امراض میں مبتلا رہتے ہیں۔ ہمیشہ پرہیزی غذا کھاتے اور چند گھنٹوں کے سکون کے لیے خواب آور دوائیں کھاتے ہیں۔ امریکہ کے ایک کروڑپتی کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ بے خوابی کے مرض میں مبتلا تھا۔ اس نے قابل ترین ڈاکٹروں سے علاج کرایا اور اس مرض سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے روپیہ پانی کی طرح بہایا لیکن میٹھی نیند کی نعمت حاصل نہ کر سکا۔ اس مرض نے اس سے زندگی کی تمام مسرتیں چھین لیں۔ وہ کہا کرتا تھا: "کاش مجھ سے کوئی فرد میری ساری دولت لے کر مجھے اطمینان کی نیند بخش دے۔" ایک ارب پتی نقصان کے خوف سے بسا اوقات رات کانٹوں کے بستر پر گزارتا تھا۔ کیا ان لوگوں سے وہ مزدور بدرجہا خوش نصیب نہیں جو دن بھر محنت کرتا ہے اور تھوڑے سے پیسے کماتا ہے جس سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتا ہے مگر روکھی سوکھی کھا کر رات بھر میٹھی نیند کے مزے لیتا ہے؟

ایک مصنف رقمطراز ہے: "مسرّت کی تلاش میں ساری دنیا سرگرداں ہے۔ انسان دیوانہ وار اس کی جستجو میں پھرتے ہیں لیکن نادان یہ نہیں سوچتے کہ یہ بڑے

بڑے ایوانوں اور سر بفلک محلات میں نہیں مل سکتی بلکہ اس کا ماخذ مہربانی کے چھوٹے چھوٹے کام، تعظیم و تکریم کے مختصر الفاظ اور خوشنما لبوں پر کھیلنے والا تبسم ہے جو ہر دل کو سہانا معلوم ہوتا ہے۔ دولت کی فراوانی، تاج و تخت کی ملکیت یا حکومت نہ اسے خرید سکتی ہے نہ اس قابل ہے کہ اسے مرعوب کر سکے"۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ مسرت کا تعلق خیالات سے ہے، زر و جواہر سے نہیں۔ اس لیے افلاس اور ناخوشی کو مترادف الفاظ نہ سمجھیے۔ اپنے دل دماغ کو مسرت کے خیالات میں بسا لیجیے۔ ان اصولوں پر عمل کیجیے جو زندگی کو پُر مسرت بنانے میں مدد دیتے ہیں تو آپ بہت سی کلفتوں سے محفوظ رہیں گے۔

خوشی مانگے تانگے کی چیز بھی نہیں جو دوسروں سے مستعار لی جا سکے۔ اس کا سرچشمہ جد و جہد اور حرکت ہے۔ شہد کی مکھی کے پَر کتر کر اس کے سامنے پھولوں کا ڈھیر لگا دیجیے، وہ ان سے کبھی شہد حاصل نہ کرے گی۔ اسے لطف آتا ہے پھول پھول پر بیٹھ کر قطرہ قطرہ شہد جمع کرنے میں۔ اپنی ذاتی سعی سے کوئی کام پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے تو انسان ضرور خوش ہوتا ہے۔ شہد کی مکھی بھی اسی فطرتی اصول کی پابند ہے۔ گھنٹوں اُڑنا، شہد حاصل کرنے کے لیے مشقت کرنا تکلیف دہ کام تو ضرور ہے لیکن مسرت کے خیالات بخشتا ہے۔ اس لیے آپ امیر ہیں یا غریب، بیکاری، تساہل پسندی اور کاہلی کو قریب نہ پھٹکنے دیجیے کیونکہ یہ قاطعِ مسرت ہیں۔

خوش رہنا ہے تو دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش بھی کیجیے۔ اگر کوئی فرد دو چار شیریں کلمات اور اظہارِ تشکر کے چند جملوں سے خوش ہو سکتا ہے، آپ کی مسکراہٹ

سے اُسے راحت مل سکتی ہے تو بخل سے کام نہ لیجیے۔ مہربانی کے چند الفاظ، کسی کی تعریف میں چند جملے کہنے سے کبھی نہ گھبرائیے۔ اس سے آپ کو نقصان تو کسی صورت نہیں ہوتا البتہ بعض اوقات فائدہ ضرور حاصل ہو سکتا ہے۔ "آپ کا شکریہ" یا "نوازش" کا جواب ممکن ہے "آپ کی عنایت" ہو، نہ ملے مگر آپ کے مخاطب کی آنکھیں زبانِ بے زبانی سے جذباتِ تشکر و امتنان کی نمائش ضرور کریں گی۔ بسا اوقات اس قسم کے الفاظ سے بگڑے کام راس آجاتے ہیں۔ میرا ایک دوست اپنا تجربہ بدیں الفاظ بیان کرتا ہے: "جب میں بی۔ اے کے امتحان میں شامل ہو رہا تھا تو فیس جمع کرانے کے لیے جو آخری تاریخ مقرر تھی، میں اس تاریخ کو یونیورسٹی کے دفتر میں پہنچا۔ زرِ نقد کی وصولی کا وقت تقریباً ختم ہو چکا تھا اور خزانچی حساب بند کر رہا تھا۔ میں حرفِ مدعا زبان پر لایا۔ تو خزانچی نے ٹکا سا جواب دے دیا اور فیس وصول کرنے سے انکار کر دیا۔

"مجھے اس انکار سے بہت صدمہ ہوا۔ میں نے اس سال خوب محنت کی تھی اور مجھے یقین تھا کہ کامیاب ہو جاؤں گا۔ اگر فیس ہی جمع نہ ہو سکی تو میری محنت اکارت جائے گی۔ میرا ایک سال ضائع ہو جائے گا۔ مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ آئندہ سال کے لیے نصاب تبدیل ہو چکا تھا جس کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ تھا کہ مجھ ایسے غریب مزدور کو تمام کتب پھر خریدنی پڑیں گی اور نئے سرے سے محنت الگ کرنی پڑے گی۔

"جی چاہتا تھا کہ خزانچی کو بے نقط سناؤں۔ اگر چوں و چرا کرے تو ٹھونک بھی دوں۔ بعد میں جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا مگر اچانک مجھے کسی دانشور کا یہ قول یاد آیا کہ

"دوسروں سے کام لینا ہو تو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے بجائے نرمی اختیار کی جائے۔" اور میں نے اسے آزمانے کا تہیہ کر لیا۔ میں خزانچی سے مخاطب ہوا:
"آپ راستی پر ہیں۔ آپ فیس وصول نہ کریں تو میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا لیکن میں اتنی بات جانتا ہوں کہ آپ چاہیں تو ایک غریب نوجوان کا جس نے اپنی ہمت سے راستہ بنایا، ایک سال بچا سکتے ہیں اور اسے مالی نقصان سے بھی محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ اگر آپ میری امداد کا کوئی راستہ نکال سکتے ہیں تو آپ کی نوازش اور اگر اس کی گنجائش ہی نہیں اور میری امداد کرنے سے آپ کی ملازمت خطرے میں پڑتی ہے یا آپ کو ذہنی کوفت ہوتی ہے تو میں آپ سے اس قربانی کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت میں تو آپ میری امداد کرنا چاہیں تو بھی میں قبول کرنے سے انکار کر دوں گا۔" ان الفاظ نے جادو کا کام کیا۔ خزانچی نے رجسٹر سے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ شاید وہ جائزہ لے رہا تھا کہ میرے الفاظ میرے جذبات کا آئینہ ہیں یا محض نمائشی ہیں۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ اُس کے سامنے جو نوجوان کھڑا ہے اُس نے یہ الفاظ خلوص سے کہے ہیں تو فیس وصول کر لی۔ آپ اسے افسانہ سمجھتے ہیں؟ مگر اسے ایک بار آزما کر تو دیکھیے۔ روزانہ جن انسانوں سے واسطہ پڑتا ہے انھیں مسکراہٹ کا تحفہ پیش کر کے تو دیکھیے۔ بکنگ کلرک سے ٹکٹ وصول کرنے کے بعد اس کا شکریہ ادا کیجیے۔ کلاتھ ہاؤس میں دیر تک کپڑا دیکھنے پر بھی آپ کو کوئی نمونہ پسند نہیں تو کیا حرج ہے؟ لیکن چلتے وقت سیلزمین کو "تکلیف معاف" کہہ دیکھیے۔ یقین جانیے یہ الفاظ سن کر وہ اپنی کلفت بھول جائیں گے اور آپ کی خدمت پر ہر وقت مستعد رہیں گے۔

کیا آپ نے یہ حکایت نہیں سُنی کہ کسی شہر میں ایک بڑھیا خالص شہد فروخت کیا کرتی تھی مگر دن بھر مکھیاں مارتی رہتی تھی اور کوئی گاہک بھُول کر بھی اس کی دکان پر نہ جاتا اور اگر کوئی ناواقف ایک بار اس غلطی کا مرتکب ہوتا تو آئندہ کے لیے اس دکان سے شہد خریدنے کا نام نہ لیتا۔ مگر اسی شہر میں ایک اور شہد فروش خاتون کی دکان پر ہر وقت خریداروں کا جمگھٹا لگا رہتا، حالانکہ اس کا شہد شکر کا قوام تھا۔ خالص شہد فروخت کرنے والی خاتون کیوں ناکام تھی؟ اس لیے کہ وہ ہر وقت ناک بھوں چڑھائے رکھتی تھی اور آخر الذکر خاتون کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ وہ خندہ پیشانی سے گاہکوں کا خیر مقدم کرتی۔ اس کے لبوں پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ آپ بھی زندگی کے بازار میں اپنی دکان سجانے سے پہلے مسکرانا سیکھیے۔

۳ - خیالات اور صحت

"بیمار جسم میں بیمار روح" مشہور مقولہ ہے اور بہت حد تک صحیح۔ جسم زخمی ہو تو روح ضرور کراہے گی لیکن اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کیجیے کہ روح بیمار ہو تو جسم کی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ جن لوگوں کے ذہن پر بیماری مسلّط رہتی ہے ان کا ایک قدم گھر میں رہتا ہے تو دوسرا اسپتال میں۔ انھیں کبھی دردِ سر کی شکایت ہے تو کبھی سوءِ ہضم کی۔ ان کے سرہانے کے قریب کی میز پر ہمیشہ دوا کی شیشیاں پڑی رہتی ہیں اور انھیں شاذ ہی صحت نصیب ہوتی ہے۔ وہ ذہنی مریض ہیں، ان کے خیالات بیمار ہیں، ایسے مریضوں کو آپ حیات بھی موت کے منہ میں جانے سے نہیں بچا سکتا۔

شاعر کہتا ہے اگر تنگ دستی نہ ہو تو تندرستی ہزار نعمت ہے مگر میں کہوں گا کہ تندرست آدمی تنگ دستی میں بھی خوش رہ سکتا ہے۔ تنگ دست کی بیماری صرف اس کی ذات کے لیے وبالِ جان نہیں ہوتی بلکہ اس کے لواحقین کے لیے بھی۔ اگر وہ بیمار رہے گا تو کمائے گا کیونکر؟ اس لیے تنگ دستی ہو یا فراخ دستی۔ تندرستی بہرحال ہزار نعمت ہے۔ یہ نعمت کیونکر حاصل کی جا سکتی ہے؟ چند سادہ اور عام فہم اصولوں پر عمل کرنے سے۔ اپنی صحت کا خیال رکھا جائے۔ روزانہ تازہ ہوا کھائی جائے۔ صبح و شام سیر اور ہلکی سی ورزش کی جائے۔ مضرِ صحت چیزیں

اور کچے، گلے سڑے پھل نہ کھائے جائیں۔ طبیعت ناساز ہو تو فوراً طبی مشیر سے مشورہ کیا جائے اور بیماری کا علاج کیا جائے لیکن ان سب سے پیشتر خیالات کے دھارے کو تندرستی، صحت اور شادمانی کی طرف موڑنا ضروری ہے ورنہ کوئی دوا اثر نہ کرے گی۔

جو لوگ ذہنی مریض بنتے ہیں وہ اپنے دشمن ہیں۔ وہ نادانستہ صحت کو تباہ کر لیتے ہیں۔ بیسویں صدی کو یوں تو ترقی کا دور کہنا صحیح ہے۔ اس دور میں علم کی روشنی چار دانگ عالم میں پھیل رہی ہے۔ فرسودہ توہمات کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ سائنس کے اکتشافات نے عناصرِ اربعہ کو صحیح معنی میں انسان کا خدمت گار بنانے میں بہت حد تک کامیابی حاصل کر لی ہے۔ وباؤں اور امراض کا قلع قمع کرنے کے لیے مفید اور زود اثر دوائیں دریافت کر لی گئی ہیں لیکن عجیب اتفاق ہے کہ زود اثر دواؤں کے ساتھ ساتھ نئے امراض بھی جنم لے رہے ہیں۔ ان میں سب سے مہلک "ذہنی مرض" ہے یعنی مریض کا یہ خیال کرنا کہ اسے صحت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کا جسمانی نظام اتنا بگڑ چکا ہے کہ اس کی اصلاح محال ہے، ناممکن ہے۔ علاج سے عارضی طور پہ آرام تو ہو سکتا ہے مگر کلی شفا اس کی قسمت میں نہیں۔ وہ بیماری سے نجات حاصل کر سکتا ہے تو ذہنی طور پہ بیماری سے قطع تعلق کر کے۔ شاید اسی لیے اس دور میں نفسیاتی معالجے کو پھر سے اہمیت حاصل ہو رہی ہے۔ کامیابی کے لیے تندرستی پہلی شرط ہے۔ آپ زندگی کی جد و جہد میں پوری طرح حصہ اسی صورت میں لے سکتے ہیں جب آپ کے قواء صحیح طور پہ کام کرتے ہوں۔ اگر آپ جسمانی اور دماغی محنت کر سکتے ہیں، اچھے منصوبے بنا سکتے ہیں اور اگر

آپ کا دماغ بیماریوں کا ٹھکانا بن چکا ہے، آپ کے خیالات مریض ہیں تو کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ بھلا ایسے دماغ میں جہاں مایوسی اور بیماری نے ڈیرے ڈال رکھے ہوں۔ کامیابی، مسرت اور ترقی کے خیالات کا گزر کیونکر ہو سکتا ہے؟

میرے ایک ڈاکٹر دوست کہا کرتے ہیں کہ "وہ ڈاکٹر جو "مریض" کو دوا کے ساتھ "امید" نہیں دیتا۔ کامیاب ڈاکٹر نہیں"۔ کیونکہ دوا سے زیادہ امید مریض کو شفا بخشتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اعتماد صحت کی بحالی میں اہم پارٹ ادا کرتا ہے۔ اگر ڈاکٹر مریض کے دل میں یہ اعتماد پیدا کر دے کہ اس کی دوا سے مریض کو افاقہ ہو جائے گا اور وہ ہفتے عشرے میں بیماری کا بستر چھوڑ دے گا تو اکثر حالتوں میں مریض بیماری سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ امریکہ میں آج کل نفسیاتی معالجے کو خاص اہمیت دی جاتی ہے اور نفسیاتی معالج کہنہ امراض کا علاج کرنے میں کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے ان کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ مریض کے دماغ سے مرض کے خیالات نکال دیں۔ جب وہ مریض کو ذہنی شفا دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو مریض جسمانی طور پر بھی بیماری سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ ایک مشہور نفسیاتی معالج لکھتا ہے کہ "میرے نفسیاتی مطب میں ایک دن ایک خاتون وارد ہوئی۔ وہ بہت کمزور اور گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا اور زندہ نعش دکھائی دیتی تھی۔ اس نے آتے ہی کہنا شروع کیا :

"ڈاکٹر صاحب! میں علاج کراتے کراتے تھک گئی ہوں۔ خدارا مجھے اس موذی مرض سے نجات دلایئے"۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں سب کام چھوڑ چھاڑ اس کے قریب جا بیٹھا۔ اس سے ہمدردی ظاہر کی اور اسے یقین دلانے لگا کہ علاج میں

کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔ اس طرزِ عمل اور ہمدردی کے چند جملوں نے مریضہ کی ڈھارس بندھائی اور اس نے مرض کی تفصیلات بتانا شروع کیں۔ مریضہ نے یہ بھی بتایا کہ وہ علاج کی خاطر برِ اعظم یورپ کا دورہ کر چکی ہے۔ برطانیہ کے نامی گرامی معالجوں کی امداد طلب کر چکی ہے۔ لیکن کوئی اس کے مرض کی صحیح تشخیص نہیں کر سکا۔ پھر وہ بڑے جوش سے کہنے لگی:

"ڈاکٹر صاحب! میرے سر کے پچھلے حصے میں دماغ کے بالکل قریب۔ رسولی ہے۔ یہاں"۔ خاتون نے سر کا ایک حصہ چھوتے ہوئے کہا "میں اسے محسوس کر سکتی ہوں۔ مگر جب میں ڈاکٹروں کو اس کے متعلق بتاتی ہوں تو وہ مجھے جھٹلاتے ہیں۔ کہتے ہیں مجھے وہم ہو گیا ہے۔ میں کیونکر ان کی باتوں کا یقین کروں۔ جب مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ رسولی موجود ہے۔ میں حلفیہ کہتی ہوں ڈاکٹر صاحب! میرے سر میں رسولی ہے آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔ خدارا مجھے اس رسولی سے نجات دلائیے"۔ یہ کہہ کر وہ خاتون کرسی پر لیٹ گئی، شاید تھکن کی وجہ سے۔ خدا جانے وہ کتنی بار اپنی روداد سنا چکی تھی اور ذہنی کوفت برداشت کر چکی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ مریضہ ذہنی مرض کا شکار ہے۔ اس کا علاج اسے جھٹلانے سے نہ ہو سکے گا بلکہ یہ تسلیم کرنے سے کہ رسولی موجود تو ہے لیکن آپریشن سے دُور ہو سکتی ہے۔ یہ الفاظ اس خاتون کے دل میں اعتماد پیدا کریں گے۔ اسے یقین ہو جائے گا کہ یہ ڈاکٹر جس نے ایسی صحیح تشخیص کی ہے اس کا کامیاب علاج بھی کر سکتا ہے۔ میں نے خاتون کے سر کا اچھی طرح معاینہ کیا اور کہا کہ رسولی موجود ہے۔ پھر ان ڈاکٹروں کو نالائق کہا جو صحیح تشخیص نہ کر سکے اور مریضہ کو بتایا کہ اس کا آپریشن کیا جائے گا۔ یہ سُننا تھا کہ مریضہ کی جان میں جان آگئی

وہ چاہتی بھی یہی کچھ تھی کہ اس کا آپریشن کر کے رسولی کاٹ دی جائے۔ اُس نے محسوس کیا کہ یہ ڈاکٹر مجھے موت کے مُنہ میں جانے سے بچا سکتا ہے۔ یہ ڈاکٹر جس کی تشخیص صحیح ہے۔" اس تصور کا اعجاز دیکھیے کہ آپریشن سے پہلے ہی اُس کی حالت بہتر ہونی شروع ہو گئی۔ وہ امید نے اُس کے نصف مرض کو علاج کے بغیر ہی رفع کر دیا اور باقی کا نصف آپریشن کا ڈرامہ کرنے سے دور ہو گیا۔ ڈرامہ کرنے سے؟ جی ہاں ڈاکٹر نے خاتون مذکور کا آپریشن نہ کیا۔ ہاں اسے نیم بے ہوش ضرور کیا۔ اُس کی ٹانگ سے تھوڑے سے بال ضرور صاف کیے۔ ایک نشتر سے جلد کو ذرا سا ضرور کاٹا۔ اور پٹی ضرور باندھی یعنی خاتون پر جو نیم غشی کی حالت میں تھی ضرور ظاہر کیا کہ اُس کا آپریشن ہو رہا ہے۔ یہی اُس کا علاج تھا اور اس علاج نے ذہنی مریضہ کو دو ہفتوں میں بھلا چنگا کر دیا۔

میرا ایک دوست بتاتا ہے کہ برف کی کثرتِ استعمال سے اسے دانتوں کے درد کی شکایت ہو گئی۔ درد اتنا شدید تھا کہ رات کو چین آتا تھا نہ دن کو آرام۔ ہفتے عشرے ہی کے اندر اس کے تمام دانت ہلنے لگے۔ اس نے یکے بعد دیگرے متعدد ڈاکٹروں سے علاج کرایا لیکن شکایت رفع نہ ہوئی۔ بالآخر ڈاکٹروں نے کہا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تمام دانت نکال دیے جائیں۔ تبھی درد سے نجات ہو سکتی ہے۔ میرے دوست نے ڈاکٹروں کا مشورہ قبول نہ کیا مگر اُسے شفا ہو گئی۔ کیونکہ؟ خود اس کی زبانی سنیے جس پر بیتی ہے۔" یہ سُن کر میں بے حد مایوس ہوا۔ میں ابھی جوان تھا اور جوانی میں دانتوں سے محروم ہو جانے پر مر جانے کو ترجیح دیتا تھا۔ اُس رات ایک تو درد ستا رہا تھا۔ دوسرے یہ خیال کہ میں جوانی ہی میں ان موتیوں

سے محروم ہو جاؤں گا۔ اس پریشانی نے میرے دماغ کو ماؤف کر رکھا تھا۔ نیند کیونکر آتی؟ چنانچہ میں بارہ بجے تک جاگتا رہا۔ دماغ پہ یہ خیال مسلّط تھا کہ اب کیا بنے گا؟ دانت میں نکلوانا نہیں چاہتا۔ پھر درد سے کس طرح چھٹکارا ہوگا؟ میں خدا سے گڑگڑا کر التجائیں کرنے لگا کہ وہ اب کی بار میری خطا معاف کر دے۔ آئندہ کبھی احتیاط کا دامن نہ چھوڑوں گا۔ انسان کو مایوسی کے عالم میں خدا جلد یاد آتا ہے اور یہی امید اسے تکلیفوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بناتی ہے۔ اس خیال سے تھوڑی سی تسکین ہوتی تھی کہ شاید خدا میری سن لے۔ پھر جب درد ستاتا تو امید کی قندیل بجھ جاتی۔ چارپائی پہ کروٹیں بدل بدل کر تنگ آگیا تو میز پہ سے ایک کتاب اٹھالی۔ یہ ایک امریکی رسالے کی جلد تھی۔ اسے کھولا تو میری نظر اس عنوان پہ پڑی "خدا ہر روز ہر طرح سے میری حالت بہتر سے بہتر بنا رہا ہے"۔ میں اس مضمون کو شوق سے پڑھنے لگا۔ یہ ایک ایسے انسان کی سرگزشت تھی جو سالہا سال بیمار رہا مگر اس جملے کو سونے سے پہلے دس بار خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھنے کے باعث اسے شفا نصیب ہوگئی۔

"اس مضمون نے مجھے نئی زندگی بخشی۔ میرے دل میں معاً خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ میں بھی اسے آزماؤں؟ اگر اس مضمون نگار کو اس نسخے کے استعمال سے صحت حاصل ہو سکتی ہے تو میرا درد کیوں رفع نہ ہوگا اور شافیٔ مطلق مجھے کیوں اس عذاب سے نہ بچائے گا؟ میں نے کتاب میز پر رکھ دی اور اس جملے کا ورد شروع کر دیا۔ اس وقت تک جب نیند کی آغوش میں چلا گیا اور صبح بیدار ہوا تو درد غائب تھا۔ مجھے اس کے بعد آج تک دانتوں کے درد کی شکایت نہیں ہوئی"۔

میرا یہ دوست کسی غیر ملک کا باشندہ نہیں۔ وہ اسی خاکِ پاک سے پیدا ہوا اور یہیں زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ خیال کی قوت کا قائل ہے اور کہتا ہے وہ شاذ ہی کبھی بیمار ہوا ہو کیونکہ اس نے کبھی بیماری کے خیالات کو پاس تک پھٹکنے نہیں دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ ہمارے یہاں گو نفسیاتی علاج کے باقاعدہ مطب موجود نہیں لیکن جھاڑ پھونک اور ٹونے ٹوٹکے ابھی تک کارفرما ہیں اور بہت سے لوگ ان کے طفیل بیماریوں سے نجات حاصل کرتے ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ اُن کے علاقے میں جب کبھی کسی جانور کو باؤلا کتا کاٹ کھاتا ہے اور دیہاتی لاعلمی میں اس کا گوشت کھا لیتے ہیں تو اس وقت جب انہیں اپنی غلطی کا علم ہوتا ہے ذرا نہیں گھبراتے بلکہ سب کے سب ایک خانقاہ کے گرد سات چکر کاٹتے ہیں۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ اب یہ موذی مرض ان میں سے کسی کو تکلیف نہیں دے سکتا اور سب کے سب اس مرض کے حملے سے بچ جاتے ہیں۔ اس علاقے کے لوگ باؤلے کتے کے کاٹے کو فوراً اس خانقاہ پر لے جاتے ہیں اور یہ علاج ہمیشہ کامیاب ثابت ہوا ہے۔

یہ لوگ ایسے خطرناک موذی اور متعدی مرض سے کیونکر بچتے ہیں؟ قوتِ اعتماد سے۔ خانقاہ کے گرد چکر کاٹنے سے ان کے دل میں یہ اعتماد پیدا ہوتا ہے کہ صاحبِ مزار کی دعا انہیں مرض سے بچا لے گی اور وہ بچ جاتے ہیں۔ مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں کہ یہ طریقِ علاج اچھا ہے یا بُرا۔ یہ شرک ہے یا نہیں البتہ اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ صحت پر خیالات ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھر کیا آپ بیماری سے بچنے اور تندرست رہنے کے لیے یہ نسخۂ شفا استعمال نہ کریں گے؟

خوف۔ انسان کا بڑا دشمن

کہتے ہیں ایک بار کسی شہر میں دس ہزار انسان وبا، طاعون کی بھینٹ چڑھ گئے۔
جب مرض طاعون اس شہر کو ویران بنا کر شہر کے دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔
تو کسی بزرگ نے اسے ٹوکا اور کہا کہ اس نے یہ ظلم کیوں کیا ہے؟
"میں نے تو صرف ایک ہزار انسانوں کی جان لی ہے"۔ طاعون نے جواب دیا۔
بزرگ: "مگر اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ اب تک دس ہزار انسان موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔"

طاعون: "یہ اعداد و شمار صحیح ہیں۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ میرا نشانہ صرف ایک ہزار افراد ہی تھے۔ باقی کے نو ہزار نے میرے ڈر سے جام فنا نوش کیا۔"

اور اس میں شک نہیں کہ دنیا میں ہزاروں افراد محض ڈر کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوتے۔ انھیں ترقی کے مواقع ملتے ہیں لیکن ڈر کا بھوت ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پاکستان کے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں میٹرک پاس نوجوان کلرکوں کی گنتی کئی ہزار ہو گی۔ ان میں سے بیسیوں اتنی قابلیت ضرور رکھتے ہیں کہ وہ آسانی سے ریگولر کمیشن کے مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ وہ صحت کے لحاظ سے بھی اس معیار پر پورے اترتے ہیں جو اس کمیشن کے لیے

مقرر کیا گیا ہے مگر وہ مقابلے کے امتحان میں شریک نہیں ہوتے محض اس ڈر سے
کہ فوجی زندگی خطرے کی زندگی ہے، فوج میں بھرتی ہوں تو انھیں جنگ میں حصّہ لینا
پڑے گا اور جنگ کے نام سے ان کی جان جاتی ہے۔ تین سال پہلے مجھے کراچی
میں ایک ذہین نوجوان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ میرے ایک عزیز کے لڑکے
کو پڑھایا کرتا تھا۔ وہ بعض دوستوں کے کہنے پر ریگولر کمیشن کے امتحان میں شامل
ہوا۔ جس میں اچھے نمبر حاصل کر کے کامیاب ہوا۔ اُسے انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔
تو اس نے حیل و حجّت سے کام لیا۔ وہ آج تک کلرک ہے۔ اسے ایک سو
بیس روپے تنخواہ ملتی ہے جس سے بسر اوقات نہیں ہو سکتی اس لیے آج تک
ٹیوشن کرتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس نے انتخابی بورڈ کے سامنے حاضر
ہونے سے اس لیے انکار کیا تھا کہ کہیں سچ مچ اسے منتخب کر نہ لیا جائے اور
اسے اپنی زندگی ہمیشہ کے لیے خطرے میں نہ ڈالنی پڑ جائے۔

ایک میٹرک پاس نوجوان کو زندگی میں اس سے زیادہ اچھا موقع اور کیا مل سکتا
ہے کہ وہ عنفوانِ شباب میں معقول مشاہرے پر باعزّت ملازمت حاصل کر لے
لیکن خوف نے متعدد نوجوانوں کو اس سنہرے موقع سے فائدہ نہیں اٹھانے دیا۔
مجھے بھرتی کے ایک افسر نے بتایا کہ انھیں ایر فورس کے لیے اچھے نوجوان نہیں
ملتے۔ ان کے پاس بھرتی کے لیے بالعموم وہ نوجوان آتے ہیں جو سول دفتروں میں
ملازمت حاصل نہیں کر سکتے۔ اس پر اگر کوئی میٹرک پاس نوجوان کہے کہ زندگی نے
اس سے انصاف نہیں کیا۔ اُس کی قسمت بُری ہے۔ اس کی کوئی سفارش نہیں
اس لیے وہ ترقی نہیں کر سکتا تو میں اسے کیونکر تسلیم کر سکتا ہوں؟

موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ جو انسان جنگ میں حصہ نہیں لیتے اور کسی سے نہیں
لڑتے، انھیں بھی موت کا ذائقہ چکھنا پڑتا ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے روزانہ
بہت سے انسان دائمی نیند سو جاتے ہیں۔ قحط اور وبائیں ایک ایک سال میں لاکھوں
انسانوں کو نگل جاتی ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں لاکھوں بنگالی دانے دانے
کو ترستے ہلاک ہو گئے۔ ہر روز حادثے ہوتے ہیں۔ ریلیں آپس میں ٹکراتی ہیں، ہوائی جہاز
گرتے ہیں، موٹر بسوں کو آگ لگ جاتی ہے، سینما گھروں کی چھتیں گر پڑتی ہیں، انسان
مرتے رہتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں موت سے ڈرنے والے نوجوان ان خطروں سے
بچ کر کہاں جائیں گے؟ کیا وہ ریل گاڑی کا سفر اس لیے ترک کر دیں گے کہ پچھلے
سال ریل گاڑیوں کے تصادم سے ایک درجن انسان مر گئے تھے؟ سینما اس لیے
نہ دیکھیں گے کہ حیدرآباد کے ایک سینما کو آگ لگ گئی تو متعدد انسان موت کا
لقمہ بن گئے تھے؟ نہیں تو پھر موت کے ڈر سے اچھے روزگار اور منصب پر لات
مارنا کہاں کی دانشمندی ہے؟

خوف انسان کا بہت بڑا دشمن ہے۔ یہ کامیابی کا دشمن ہے۔ صحت کا دشمن ہے
اور مسرت کا مخالف۔ وہ انسان جو موہوم خطروں میں گھرے رہتے ہیں، موہوم مصیبتوں
سے اُن کے حواس پراں رہتے ہیں، ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے رہ جاتے
ہیں۔ وہ ہر وقت ایک ایسے بار کے نیچے دبے رہتے ہیں کہ ابھرنا محال ہو جاتا ہے۔
بزدل مرنے سے پہلے سو سو بار مرتے ہیں۔ بسا اوقات اُنھیں دن میں ایک آدھ
بار موت کا سایہ ضرور دکھائی دیتا ہے۔ یہ کمزوری اُنھیں لے ڈوبتی ہے۔ وہ ترقی
کے مستحق نہیں سمجھے جاتے۔ لوگ انھیں ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہدفِ مزاح

بناتے ہیں۔

ڈرپوک آدمی کی قوتِ ارادی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ معمولی خطرات کا مقابلہ کرنے سے ڈرتا ہے۔ ہر وقت دوسروں کی تمناؤں اور خواہشوں کا احترام کرتا ہے۔ دوسروں کے جذبات کا احترام بری بات نہیں لیکن اس ڈر سے کہ کہیں ہمسایہ ناراض نہ ہو جائے اپنی آسائش کا خیال نہ رکھنا یا اس لیے ترقی کی کوشش نہ کرنا کہ ساتھی برا مانے گا۔ روا نہیں۔ افسر کی مرضی کے مطابق کام کرنا عین سعادت ہے لیکن یہ فرض کر لینا کہ میرا کام میرا افسر بہر حال ناپسند کرے گا اس ڈر سے کام کو ہاتھ ہی نہ لگانا پرلے درجے کی حماقت ہے۔ اس قسم کے افراد یہ بھی نہیں جانتے کہ کام نہ کرنے سے افسر زیادہ ناراض ہوگا بہ نسبت اس کے کہ کام اس کی مرضی کے مطابق نہ ہو۔

میں ایک گریجویٹ کو جانتا ہوں جو ایک سال سے بیکار بیٹھا ہے۔ آپ اس سے اس کی وجہ دریافت کیجیے تو بتائے گا کہ آج کل بیکاری کا دور دورہ ہے سینکڑوں تعلیم یافتہ ملازمت کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔ وہ دفتروں کا طواف کرتے ہیں مگر ان کا خیر مقدم کوئی جگہ نہیں سے کیا جاتا ہے۔ درحقیقت موجودہ زمانے میں ماہرین اور صناعوں کی ضرورت ہے، ہم ایسے آرٹ گریجویٹوں کی نہیں۔ اگر میں انجینئر ہوتا تو مجھے کب کی ملازمت مل جاتی۔ میں ٹائپ اور شارٹ ہینڈ میں شُدبُد تو رکھتا ہوں لیکن کسی دفتر میں کام نہیں کیا۔ پھر مجھ ایسے ناتجربہ کار کو کوئی ملازم رکھے تو کیوں؟ آپ ان دلائل کو معقول سمجھیں گے؟ لیکن میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس نوجوان کی بیروزگاری کا سبب وہ نہیں جو اس نے بتایا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ احساسِ کمتری کا مریض ہے۔ وہ اخباروں میں "ضرورت ہے"

کا کالم ہر روز باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہے۔ ایک آدھ ادارے کو درخواست بھیج دیتا ہے۔ اسے دو چار دن کے اندر انٹرویو کے لیے بلایا جاتا ہے اور وہ اچھا سوٹ پہن کر چل پڑتا ہے۔ لیکن ناکام لوٹتا ہے۔ گھر والے اس سے انٹرویو کا نتیجہ پوچھتے ہیں تو بتاتا ہے کہ انٹرویو ہوا ہی نہیں۔ کیونکہ ڈائرکٹر صاحب بہت مصروف تھے۔ کبھی کہتا ہے اس کی خدمات اس لیے قبول نہیں کی گئیں کہ وہ تجربہ کار نہیں اور کبھی کوئی اور وضعی جواب سنا دیتا ہے۔ وضعی جواب؟ جی ہاں بالکل وضعی۔ یہ تمام کے تمام جوابات اس کے دماغ کی اختراعیں ہیں۔ جب اس نے آج تک کسی ڈائرکٹر سے ملاقات ہی نہ کی ہو تو اسے ان کا دلی عندیہ کیونکر معلوم ہو سکتا ہے؟ وہ گھر سے تیار ہو کر جاتا ہے۔ جب دفتر کے سامنے پہنچتا ہے تو اس پر دفتر کی عالیشان عمارت کی ہیبت چھا جاتی ہے۔ وہ اندر داخل ہونے کی جرأت ہی نہیں کرتا اور کبھی دروازے سے جھانک کر لوٹ آتا ہے۔ جب دیکھتا ہے کہ دفتر میں درجن بھر کلرک بیٹھے کام کر رہے ہیں تو اسے پسینہ چھوٹ جاتا ہے اور اُلٹے پاؤں واپس ہوتا ہے۔ واپسی کے وقت پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔ اس نوجوان کو کیونکر ملازمت مل سکتی ہے؟ اس کا دشمن کون ہے؟ ڈر۔ کسی کا سامنا کرنے کا خوف۔ احساسِ کمتری۔

ڈر کیا ہے؟ ایسے خیالات جو رائی کو پہاڑ بنا کر دکھائیں اور انسان کو خوف زدہ کریں یا ایسے اوہام جن کی وجہ سے انسان کو مشکلات ہی مشکلات نظر آئیں، ایسی مشکلات جن کا رفع کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ وہ انسان بدقسمت ہے جو ڈر کے خیالات اور اوہام کا شکار بنا رہتا ہے۔ اس کے لیے ترقی کے دروازے ہمیشہ مسدود رہتے ہیں۔ مسرت اس کے قریب نہیں پھٹک سکتی۔ وہ زندگی کی نعمتوں سے

محض ڈر کے باعث محروم رہتا ہے۔ میں ایک معزز پاکستانی کو جانتا ہوں جس نے اپنے مکان میں بجلی کے پنکھے اس لیے نہیں لگوائے کہ کہیں وہ اس کے اوپر نہ گر پڑیں۔ وہ کسی کے یہاں جاتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کی کرسی کہیں پنکھے کے نیچے تو نہیں۔ ایک بار میرے دفتر میں تشریف لائے۔ گرمی کا موسم تھا۔ پنکھا پورے زور سے چل رہا تھا۔ اتفاق سے جس نشست پر انھیں بیٹھنا تھا وہ پنکھے کے عین نیچے تو نہ تھی لیکن زیادہ دُور بھی نہ تھی۔ وہ اس نشست پہ ڈرتے ڈرتے بیٹھ تو گئے۔ لیکن اس وقت تک چین نہ لیا۔ جب تک پنکھا بند کرانے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ نہ لیا۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کھانا اُس وقت تک نہیں کھاتے جب تک اسے پہلے کوئی اور نہ چکھ لے۔ غرض وہ ہر وقت ہراساں رہتے ہیں اور موہوم خطرات کی وجہ سے خدا کی دی ہوئی بعض نعمتوں سے محروم رہتے ہیں۔

یہ بزرگ ان پڑھ نہیں۔ اچھے خاصے تعلیم یافتہ ہیں۔ انگریزی کے انشا پرداز ہیں امیر ابن امیر ہیں۔ سیاست دان ہیں۔ آپ اُن کے وہم پہ تعجب ضرور کریں گے لیکن اس بات کا جائزہ تو لیجیے کہ کہیں آپ بھی اس مرض میں مبتلا تو نہیں۔ آپ کے پاس سرمایہ ہے۔ آپ کاروباری صلاحیت بھی رکھتے ہیں لیکن اس ڈر سے اپنا روپیہ کاروبار میں نہیں لگاتے کہ کہیں وہ ضائع نہ ہو جائے۔ آپ ذہین ہیں، تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ کی معلومات ان نوجوانوں سے زیادہ ہیں جو سول سروس کے امتحان مقابلہ میں شریک ہو رہے ہیں، آپ کے جاننے والے آپ کی قابلیت کے معترف ہیں مگر آپ امتحان میں محض اس لیے نہیں بیٹھتے کہ مبادا ناکام ہو جائیں اور لوگ آپ کی قابلیت پر انگشت نمائی کریں۔ آپ اچھے مضمون نگار ہیں۔ انعامی مضمون لکھنے کی جرأت نہیں

کرتے کہ شاید آپ کے مضمون کو معیاری نہ سمجھا جائے۔ آپ کسی جلسے میں تقریر کرنے کی دعوت اس لیے مسترد کر دیتے ہیں کہ کہیں آپ کی تقریر سن کر لوگ آوازے نہ کسیں۔ تو آپ کی حالت اس بزرگ سے بہتر نہیں۔ وہ وہم کے مرض کا شکار ہیں تو آپ خوف کی بیماری میں مبتلا۔ ان کا وہم انھیں زندگی کی کچھ نعمتوں سے تو محروم رکھتا ہے لیکن کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اُن کی امارت، اُن کی تعلیم آڑے آتی ہے لیکن آپ کے خوف نے آپ کے گرد مضبوط فصیل تیار کر رکھی ہے اور آپ کو اچھی چیزوں سے محروم کر دیا ہے۔ پھر کیا اس بات کی ضرورت نہیں کہ آپ اس بزرگ کے وہمی ہونے پر خندہ زن ہونے کے بجائے اپنی اصلاح کریں؟ اس فصیل کو جو خوف کی وجہ سے آپ کے گرد بنی ہوئی ہے ڈھا دیں اور اپنے بڑے دشمن خوف کو شکست دیں۔

ڈاکٹر مارڈن کہتے ہیں کہ انھوں نے چند کم ہمت نوجوانوں سے مبادلۂ خیالات کیا اور ان سے دریافت کیا کہ انھوں نے بعض مواقع کیوں ہاتھ سے جانے دیے جب انھیں مواقع سے ایسے لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہے جو بظاہر ان سے زیادہ قابل نہ تھے۔ ان کے جوابات سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ ڈرپوک تھے۔ انھوں نے ناکامی کے خوف سے ان مواقع سے فائدہ حاصل کرنے کی جرأت ہی نہیں کی۔ ایک نے اعتراف کیا "مجھ میں جرأت نہیں"۔ دوسرے نے کہا "مجھے اپنی ذات پر بھروسا نہیں"۔ تیسرا کہنے لگا "مجھے اس بات کا ڈر رہتا ہے کہ کہیں مجھ سے غلطی نہ ہو جائے، اسی لیے مجھے ناکامی کا غم برداشت کرنا پڑتا ہے"۔ چوتھے نے جواب دیا "مجھے آگے بڑھنے سے شرم محسوس ہوتی ہے"۔ ایک نے کہا "مجھے حق حاصل نہیں کہ اپنی

قابلیت سے اس قدر اعلیٰ عہدے کی خواہش کروں۔ مجھے اس کے حاصل کرنے کی اُس وقت تک کوشش نہ کرنی چاہیے جب تک اتنی لیاقت بہم نہ پہنچا لوں۔ اور یہ حضرات اس عہدے کے لیے کبھی لیاقت بہم نہ پہنچا سکیں گے۔ وہ ہر وقت یہی سمجھیں گے کہ مزید لیاقت درکار ہے۔

ہم میں سے اکثر ترقی کے لیے اس ڈر سے کوشش نہیں کرتے کہ لوگ مضحکہ اڑائیں گے، افسر ناراض ہو جائیں گے، ساتھی احمق کہیں گے۔ اگر کوئی ایسی دوا تیار کی جا سکے جو ڈر کے جراثیم کو ہلاک کر دے تو خاکسارانِ جہاں میں سے بیشتر گرد سوار نکل آئیں، گرد سوار جن پر ان کے والدین، احباب اور اہلِ وطن ناز کریں۔ مگر دوا کی ضرورت؟ جب ہم ڈر کے خیالات سے دور رہ کر اس بڑے دشمن "ڈر" کو شکست دے کر کامیاب ہو سکتے ہیں۔

یقینِ محکم

ا- بلند خیالی

باغ کی روشوں پر آپ مصروفِ گلگشت ہیں۔ عروسانِ چمن کے حُسن کا نکھار آپ کا دل لبھا رہا ہے۔ شمیم جانفزا کے معطّر جھونکے آپ کی روح کو پُر کیف بنا رہے ہیں۔ پھولوں کا حسن اور نزاکت دیکھ دیکھ کر آپ کی آنکھوں میں سرور پیدا ہو رہا ہے۔ نشے اور بے خودی کے متوالے دوست! حُسن اور رعنائی کے جہان کی سیر کرنے والے عزیز! یہ کیا چیز ہے جو آپ کو مست و بے خود بناتی ہے؟ باغ کی روشیں یا پھولوں کا حسن؟ لیکن اس دن جب آپ کی محبوبہ آپ کو داغِ مفارقت دے گئی تھی اور آپ یہاں دل بہلانے آئے تھے آپ غم والم اور اضطراب کا مجسمہ تھے آپ کے خط و خال سے غم اور بے چینی کا اظہار ہو رہا تھا۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈھلک رہے تھے، آپ کا دھیمے سُر میں گنگنانا نغمۂ غم تھا۔ کیا پھول اُس دن رنگین نہ تھے؟ مرغانِ خوش نوا کے نغمات روح پرور نہ تھے؟ پھر کیا باور نہ کریں گے:

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

حقیقت میں باغ کی دلکشیوں کے سوا کوئی اور چیز نہ تھی جس نے آپ پر ایک ہی مقام پر دو متضاد کیفیتیں طاری کیں اور وہ آپ کے خیالات تھے جنھیں ساتھ لے کر آپ گلشن میں داخل ہوئے۔ پہلی بار اپنے حبیب کی موت کے درد انگیز تاثرات ہمراہ لائے،

اور آج فطرت کی رعنائیوں کا مطالعہ فلسفۂ مسرت کے تحت کر رہے ہیں۔

فی الحقیقت ہماری زندگی ہمارے خیالات کا عکس ہے۔ نسلِ انسانی تباہی سے دوچار ہوتی ہے یا امن عالم کا منصوبہ بنایا جاتا ہے۔ استبداد کا بھوت کمزور اقوام پر ظلم وستم روا رکھتا ہے یا کوئی غلام قوم آزادیٔ وطن کے لیے فرزندانِ وطن کی جانیں نثار کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ یہ سب کرشمے خیالات کے ہیں۔ انسانی دماغ میں کسی کام کے انجام دینے کا خیال پہلے پیدا ہوتا ہے اور اس پر عمل بعد میں ہوتا ہے۔ اس لیے ہماری بھلائی اس میں ہے کہ ہم بلند خیالی کو شعار بنائیں تاکہ ہماری زندگی بھی رفعت وعظمت سے آشنا ہو۔

دُنیا کے کامیاب افراد کا تجربہ ہوتا ہے کہ اُن کی کامیابی رہینِ منت ہے اُن کی بلند خیالی کی۔ اُنھوں نے پہلے اپنا نصب العین قائم کیا، پھر اُس کے حصول کے لیے مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔ غریبی اور افلاس ان کی راہ میں سدِّ راہ نہ ہو سکے۔ فقدانِ تعلیم سے ان کا راستہ مسدود نہ کیا جا سکا اور سفارش نہ رکھنے کی وجہ سے وہ پیچھے دھکیلے نہ جا سکے۔ وہ کامیاب ہوئے کیونکہ انھوں نے کامیاب ہونے کا عزم کر رکھا تھا۔ وہ بلند خیال تھے۔ وہ اپنے آپ کو بلندی تک پہنچنے کا حقدار سمجھتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے اُنھیں بڑی جدوجہد کرنا پڑی۔ بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا لیکن ان کی کامیابی ظاہر کرتی ہے کہ بلند خیال انسان کامیاب ہو سکتا ہے۔ لنکن اور مصطفیٰ کمال بن سکتا ہے اور فورڈ اور راک فیلر کی طرح دولت حاصل کر سکتا ہے۔

روزگار تلاش کرنے والے دو شخص ایک ہی محکمے میں کلرک بھرتی ہوتے ہیں۔

دونوں میٹرک پاس ہیں، نوجوان ہیں مگر ان میں سے ایک کا کوئی نصب العین نہیں وہ ملازمت چاہتا تھا جو مل گئی ہے اس لیے وہ مطمئن ہے۔ وقت مقررہ پر دفتر جاتا ہے۔ دن بھر وہاں کام کرتا ہے۔ جب چھٹی ہوتی ہے تو دوست احباب کے ساتھ اپنے وقت کا زیادہ حصہ سیر و تفریح میں گذارتا ہے۔ اُسے اس بات سے غرض نہیں کہ اس کا کوئی ساتھی اپنی استعداد بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ اسے اگلا گریڈ دیا جائے مگر دوسرا کلرک اپنی زندگی بہتر بنانے کا آرزو مند ہے۔ جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ شارٹ ہینڈ سیکھ لینے کے بعد اس کی تنخواہ دگنی ہو سکتی ہے تو وہ فوراً اُس درس گاہ میں داخل ہو جاتا ہے جہاں رات کو شارٹ ہینڈ سکھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جب تک دفتر میں رہتا ہے اپنا کام دل لگا کر کرتا ہے۔ ہر بات کی تہ تک پہنچتا ہے۔ کامیابی کا ایک مرحلہ طے کرتا ہے۔ پھر اگلے مرحلے کے عبور کرنے کا مصمم ارادہ کر لیتا ہے۔ بالآخر وہ دن آتا ہے جب وہ اول الذکر کلرک کو ترقی کے میدان میں پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ اب اگر تساہل پسند کلرک شکوہ کرے یا کہے کہ اس کا ساتھی قسمت کا دھنی ہے، حالات اس کے سازگار تھے اس لیے اُسے ترقی کا موقع مل گیا تو اسے کون تسلیم کرے گا؟

ایک بار میں نے بی۔ ٹی کلاس میں داخل ہونے والے دو طالب علموں سے دریافت کیا کہ وہ اس جماعت میں کیوں داخل ہو رہے ہیں جب وہ جانتے ہیں کہ انھیں بی۔ ٹی پاس کرنے کے بعد بی۔ ٹی کا گریڈ نہ مل سکے گا تو ایک نے جواب دیا "یہ درست ہے کہ امتحان پاس کرتے ہی میں گریڈ حاصل نہ کر سکوں گا مگر محکمہ تعلیم کا دروازہ تو میرے لیے کھل جائے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا طبعی رجحان

تعلیم و تعلّم سے ہے۔ اس لیے میں اس محکمے میں ترقی کر سکوں گا۔" دوسرے متعلّم نے کہا "بھائی کیا کروں، ملازمت کہیں ملتی نہیں، بی۔ ٹی پاس کرنے کے بعد ملازمت کا ملنا تو یقینی ہے۔ رہا سوال ترقی اور گریڈ کا، سو میری بلا سے نہیں ملتا ہے تو نہ ملے، مجھے ملازمت کی ضرورت ہے سو وہ تو مل کر رہے گی۔" اگر اوّل الذکر طالب علم آخر الذکر کو میدانِ ترقی میں پیچھے چھوڑ جائے تو جائے تعجب نہیں۔ سوچیے جب ہر محکمے میں بھرتی ہونے والے بعض افراد بلند خیالی اور ذاتی جد و جہد کے طفیل دوسروں سے آگے بڑھ جاتے ہیں تو پھر ہم اپنے لیے بلند خیالی کو کیوں لازمی شے نہ سمجھیں؟

سر شادی لال کے متعلق ایک آدمی بیان کرتا ہے کہ اس نے اس نامور قانون دان کو ایک بار ایک معمولی مقدمے میں حقیر معاوضے پر وکیل کیا تھا۔ اُن دنوں اُس سٹریٹ میں جس میں شادی لال وکیل رہا کرتا تھا کئی اور وکیل ہوں گے جو شادی لال سے زیادہ معاوضہ لیتے ہوں گے مگر یہ معمولی وکیل ایک صوبائی عدالت کا چیف جسٹس اور پریوی کونسلر بن کر رہا جب اس سے زیادہ معاوضہ لینے والے وکیل ضلع کی کچہریوں میں وکالت کرتے کرتے مر گئے۔ شادی لال کیوں کامیاب ہوا؟ اس لیے کہ وہ صرف وکیل بنے رہنے پر قانع نہ تھا۔

مولانا ابو الکلام آزاد لکھتے ہیں:

"دنیا کی تمام کامرانیاں صرف امید کے قیام پر ہی موقوف ہیں۔ یہ امید ہی ہے جس نے زمین پر قبضہ کیا ہے۔ پہاڑوں کے اندر راستہ بنایا ہے۔ سمندروں کی قہاری کو مغلوب کیا ہے جس نے مردہ قلوب کو زندہ کیا ہے۔ بسترِ مرگ سے

بیماروں کو اٹھایا ہے۔ ڈوبتوں کو کناروں تک پہنچایا ہے۔ بچّوں کو نوجوانوں کی تیزی سے دوڑایا ہے اور بوڑھوں کو جوانوں سے زیادہ قوی اور طاقت ور بنایا ہے۔"

امید یا بلند خیالی ایک شمع ہے جو نہاں خانۂ دل میں جہاں تاریکیوں کے بادل چھائے ہیں جہاں یاس و قنوط کا غبار ہے روشنی پہنچاتی ہے۔ تاریکیوں اور غبار کو دور کرتی ہے اور انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ جد و جہد کر کے منزلِ مقصود تک پہنچے۔

بنجمن ڈسرائیلی ایک معمولی مصنّف تھا۔ اسے پارلیمنٹ کا ممبر بننے کی دھن سمائی تھی۔ اس نے کئی بار قسمت آزمائی کی مگر بار بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایک دن وہ ایک لارڈ کی ملاقات کے لیے گیا تو لارڈ موصوف نے کہا "کیوں رکنیت کے پیچھے پڑے ہو، خواہ مخواہ وقت اور روپیہ ضائع کر رہے ہو؟ اس خیالِ خام سے باز آؤ اور میرے سکرٹری بن جاؤ۔" مگر ڈسرائیلی نے سکرٹری بننے سے انکار کر دیا۔ وجہِ انکار دریافت کرنے پر بتایا کہ وہ پارلیمنٹ کا ممبر بننا چاہتا ہے اور اس کے بعد برطانیہ کا وزیر اعظم۔ اس کا یہ جواب حیران کن اور کسی قدر مضحکہ خیز ہے۔ جو شخص کئی بار پارلیمنٹ کا ممبر بننے کی جد و جہد کر چکا ہو اور اسے ہر دفعہ شکست نصیب ہوئی ہو وہ وزیر اعظم بننے کا خواب دیکھے! مگر آپ کی حیرت بجا نہیں کیونکہ یہ شکست نا آشنا یہودی برطانیہ کا وزیر اعظم بن کر رہا۔ اس کی بلند خیالی اسے قلمدانِ وزارت دلا کر رہی۔ ہندوستان کی تاریخ میں بھی ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں جو ہمیں بلند خیالی سکھاتی ہیں۔ ان میں سے شیر شاہ سوری کی مثال بہت سبق آموز اور دلچسپ ہے۔ شیر شاہ ایک معمولی جاگیردار کا بیٹا تھا۔ کسے یقین تھا کہ سہسرام میں اپنے باپ کی جاگیر پر انتظامی

تجربے کرنے والا نوجوان افغان ایک دن ایک عظیم الشان سلطنت کا نظم و نسق سنبھالے گا اور سلطنتِ خاندانِ مغلیہ کا سلسلہ منقطع کرکے درمیان میں خاندانِ سور کے ایک نئے باب کا اضافہ کرے گا۔ بلند خیالی نے اس کا راستہ صاف کیا اور وہ مغل شہنشاہ کو ہندوستان سے باہر نکالنے اور ہند کا شہنشاہ بننے میں کامیاب ہو گیا۔

ایک مغربی مفکر کا قول ہے "ہوائی قلعے بنانا زمین پر قلعے بنانے کی بنیاد ہے۔" فی الواقع ایک عظیم الشان محل کی تیاری سے پہلے اس کا خاکہ دماغ میں بنتا ہے۔ پھر کاغذ پر نقشہ مرتب ہوتا ہے اور اس کے بعد زمین پر بنیاد کھودی جاتی ہے جو انجینئر اس اصول پر عمل نہیں کرتا وہ کامیاب انجینئر نہیں۔ اصل میں خیالات اساس ہوتے ہیں کسی رفیع الشان عمارت، اعلیٰ کام اور بلند منصب کے۔ ہمارے خیالات جس قدر بلند ہوں گے اسی قدر رفعت ہمیں نصیب ہو گی۔ مقابلے کی دوڑ میں جو آدمی یقین رکھتا ہے کہ وہ اوّل رہے گا بالعموم اوّل ہی رہتا ہے۔ وہ لوگوں کے قلوب پر چھا جاتا ہے، ان کے خیالات کو اپنے موافق بناتا ہے۔ غالباً اسی لیے لوگ اس کے اوّل رہنے کی پیش گوئی کرتے ہیں اور اگر اولیت کا فخر نہیں حاصل کر سکتا تو دوسرا درجہ تو کہیں گیا نہیں۔ کامیابی کا سہرا اسی کے سر رہتا ہے جسے کامیابی کا یقین ہوتا ہے کیونکہ جیت کے لیے دوڑنے کے علاوہ جیت کا یقین بھی لازم ہے۔ جریدہ "السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا" اس خبر کا ذمہ دار ہے کہ ایک دفعہ کسی امریکی عورت کا اکلوتا بیٹا سمندر دیوتا کی بھینٹ چڑھ گیا۔ وہ ساحل پر روتی ہوئی آئی اور سمندر سے کہا "اے شاندار اور بزرگ سمندر! اگرچہ تو نے میرا لختِ جگر مجھ سے چھین لیا اور اسے موت کا پیالہ پلایا مگر اس کی نعش مجھے دے دے تاکہ میں اس پر

چار آنسو تو بہا سکوں اور اسے عیسائی رسوم کے مطابق قبر میں دفنا سکوں" سمندر شاید بہرا ہے کیونکہ وہ ایسی درخواستیں کم سنا کرتا ہے یا پھر سنگ دل ہے جس پہ اس قسم کی عرضیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا کرتا۔ چنانچہ اس نے اس غریب اور دکھی عورت کی درخواست کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا مگر وہ عورت بھی شاید پتھر کا کلیجا رکھتی تھی۔ اُس نے وہاں سے ٹلنے کا نام نہ لیا۔ وہیں ڈیرے ڈال دیے۔ وہ روزانہ سمندر کو اپنی پکار سناتی رہی۔ بالآخر سمندر اپنی عادت کے خلاف اس کی فریاد سننے پر مجبور ہو گیا اور چونسٹھ دن کے بعد اس کے بیٹے کی نعش اس کے قدموں میں لا ڈالی۔

ایک قدیم مشرقی کہانی بھی اس واقعے سے کم دلچسپ نہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک شہزادی کی انگشتری سمندر میں گر پڑی۔ اُس نے اعلان کیا جو جوانمرد یہ انگشتری سمندر سے نکال لائے گا وہ اس کے ساتھ شادی کرے گی۔ ہوس پرست عشاق کا عشق تو یہ اعلان سنتے ہی ہرن ہو گیا مگر عاشق صادق نے انگشتری لانے کے لیے کمر باندھ لی اور ایک پیالہ لے کر سمندر کا پانی باہر نکالنا شروع کر دیا۔ جب کوئی راہرو ادھر سے گزرتا اور اس سے دریافت کرتا "حضرت یہ کیا ہو رہا ہے؟" تو وہ جواب دیتا "سمندر کا پانی باہر نکال رہا ہوں۔ تاکہ جب یہ خشک ہو جائے تو میں اپنی محبوبہ کی انگشتری حاصل کر کے اس کی خدمت میں پیش کر سکوں۔" راہرو یہ سن کر مسکرا دیتا مگر اس کے عزم و استقلال میں فرق نہ آتا، نہ اس کے یقین کی دیوار منہدم ہوتی مچھلیاں کچھ دیر تو اُس کی یہ حرکات خاموشی سے دیکھتی رہیں لیکن چندے بعد اپنی ملکہ کو صورتِ حال سے خبردار کیا۔

ملکہ نے انھیں حکم دیا کہ اُس کے پاس جاؤ اور دریافت کرو کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ جب اُس نے اپنا مدعا ظاہر کیا تو مچھلیوں نے کہا "بھلے آدمی سمندر یوں خشک تھوڑا ہی ہوگا۔ اس خیالِ خام سے باز آؤ اور ہمیں بلاوجہ تکلیف نہ دو۔" اس نے جواب دیا "یہ سمندر میرے سامنے کیا حقیقت رکھتا ہے میں اسے خشک کرکے ہی دم لوں گا، مجھے ہر قیمت پر انگشتری حاصل کرنا ہے" مچھلیوں نے ایک تیز رفتار قاصد کو تمام واقعات بتا کر ملکہ کی خدمت میں بھیجا۔ ملکہ نے صورتِ حال سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد اُسے کہلا بھیجا کہ اُسے انگشتری درکار ہے یا وہ سمندر کو خشک کرنا چاہتا ہے۔ عاشقِ صادق کو انگشتری درکار تھی، سمندر کے خشک ہونے نہ ہونے سے اُسے کیا تعلق۔ اس لیے اس نے اپنا عندیہ ظاہر کر دیا۔ ملکہ کی جان میں جان آئی۔ اس نے مچھلیوں کو حکم دیا کہ وہ فی الفور انگشتری تلاش کرکے اس کے حوالے کریں، اس دُھن کے آدمی سے بعید نہیں کہ وہ سمندر کو خشک کر دے اور ہمیں مصیبت میں ڈال دے۔

بلند خیالی ہمیں خطرات اور حوادث کا مقابلہ کرنے کے قابل بناتی ہے۔ ہمیں یقین ہوتا ہے کہ اس مشکل کا مقابلہ کرنے کے بعد ہم جو انعام حاصل کریں گے وہ ہماری توقعات سے زیادہ قیمتی ہوگا۔ اس لیے ہم خوشی خوشی مشکلات کی بھٹی میں کود پڑتے ہیں۔ بلند خیالی کے طفیل ہم اپنے ہمعصروں سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ سر شفیع اور سر فضل حسین پنجاب کے ایسے ہی وکیل تھے جیسے اُن کے کئی ہم عصر وکیل ممکن ہے قانون کے پرچے میں اُن کے کسی ہم جماعت نے ان سے زیادہ نمبر حاصل کیے ہوں، مگر بلند خیالی نے اُنھیں نہ صرف کامیاب وکیل ہی بنایا بلکہ نامور سیاستدان

بھی۔ وہ اس کامیابی کے مستحق اس لیے قرار دیے گئے کہ بلند خیال تھے۔ وہ گاہکوں کی جیبیں خالی کرنے والے وکیل بنے رہنے پر قانع نہ تھے بلکہ اپنے آپ کو کسی اور دنیا کا شہسوار سمجھتے تھے اور وہ اس کے شہسوار بن کر رہے۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ واہ جیسے غیر معروف گاؤں میں پیدا ہونے والا سکندر حیات خاں کچھ عرصے تک ایک معمولی ملازمت کا امیدوار رہا۔ اس نے یہ ملازمت حاصل کرنے کے لیے کئی بار ڈپٹی کمشنر کے بنگلے کا طواف کیا مگر کامیاب نہ ہوا جب اس نے اپنی زندگی کا رُخ بدل دیا، اپنے اندر کے سوتے ہوئے سکندر کو باہر نکالا تو وہ پنجاب کا گورنر بنا اور مدتوں وزیرِ اعظم رہا۔ جب تک سکندر حیات خاں اپنی قدر و قیمت سے آگاہ نہ ہوئے جب تک وہ پست خیال رہے ناکام رہے لیکن جب بلند خیالی اختیار کی تو اسی صوبے کے وزیرِ اعظم بنے جس کے سول افسروں کی بارگاہِ عالی میں معمولی ملازمت کے لیے کشکولِ گدائی لے کر گئے تھے۔ بلند خیالی نے انھیں اس قابل بنایا کہ ان افسروں سے کام لیں جن کے پاس ملازمت کی درخواست لے کر گئے تھے۔

میں اپنے ضلع کے ایک لیڈر کو جانتا ہوں جو گریجویٹ ہونے کے بعد ڈسٹرکٹ بورڈ کے سکرٹری بن گئے۔ اُن کے والد خوش تھے کہ اُن کا نورِ نظر اچھی ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ مگر وہ خود موجودہ ملازمت سے مطمئن نہ تھے۔ وہ ضلع کے ایک اچھے خاندان کے چشم و چراغ تھے، گریجویٹ تھے، ان کے لیے سکرٹری بننا فی الواقع اعزاز نہ تھا اس لیے وہ مستعفی ہو گئے۔ ان کے والدِ گرامی کو رنج تو ہوا لیکن اُن کے فرزند نے تھوڑے ہی عرصے میں ثابت کر دیا

کہ اس کا فیصلہ صحیح تھا۔

وہ ڈسٹرکٹ بورڈ کی سکریٹری شپ سے مستعفی ہونے کے بعد مرکزی اسمبلی کے رُکن بنے۔ پھر ایک ریاست کے وزیر اور آج کل حکومت پاکستان کی طرف سے ایک معزز عہدے پر فائز ہیں۔ اگر وہ بلند خیال نہ ہوتے اور سکریٹری بن جانا غنیمت جانتے تو شاید آج بھی سکریٹری ہی ہوتے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے اَن پڑھ ارکان سے بھی کم معزز۔

حقیقت یہ ہے کہ خیالات کی رفعت انسان کو بلند مراتب تک پہنچاتی ہے، اس کی پوشیدہ قوتوں کو ظاہر کرتی ہے اور اسے اپنی حقیقت سے آگاہ کرتی ہے۔ بلند خیال آدمی جب ایک دفعہ اپنی طاقت معلوم کر لیتا ہے اور میدانِ عمل میں کود پڑتا ہے تو پھر وہ معمولی عہدے، تنخواہ یا اسامی پہ مطمئن نہیں رہ سکتا۔ اس کا خیال اسے اور آگے بڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔

بلند خیالی کا مطلب یہ نہیں کہ ہم دل و دماغ کو اعلیٰ خیالات سے معمور کر کے عمل سے کوئی واسطہ نہ رکھیں یا پہلی ہی جست میں سب سے آخری منزل تک پہنچنے کی کوشش کریں اور جب اس میں ناکام ہو جائیں تو حوصلہ ہار بیٹھیں۔ نہ بلند خیالی کا مفہوم یہ ہے کہ خیال سے تو کامیابی کے رنگ محل میں پہنچ جائیں مگر عمل کا وقت آئے تو یہ ذمہ داری کسی اور کے دوش پر ڈالی جائے۔ ایسی بلند خیالی کسی کام کی نہیں اور اسے افیون سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ اس لیے دنیا میں کامیاب ہونا ہے تو بلند خیالی کے ساتھ ساتھ حسنِ عمل کو بھی شعار بنائیں، منزلِ مقصود کی طرف قدم بقدم بڑھیں، ایک مرحلہ طے کر لیں تو اگلے مرحلے کے طے کرنے کا فیصلہ کر لیں۔

یوں منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔

بلند خیالی سے انسان کے دل میں جرأت پیدا ہوتی ہے اور وہ مصروفِ عمل ہو جاتا ہے جو لوگ ملک و ملت کی خدمت کرتے ہیں وہ صحیح معنی میں بلند خیال ہوتے ہیں بلند خیالی ہی انھیں کڑی مصائب جھیلنے کے قابل بناتی ہے اور یہی ترقی کے افق پہ لے جاتی ہے۔

اپنے آپ کو کمزور اور حقیر سمجھنا سمِ قاتل ہے۔ جس انسان کے قلب و جگر میں یہ زہر سرایت کر جاتا ہے۔ وہ کبھی ترقی کا خواب نہیں دیکھ سکتا۔ وہ دوسروں کے احکام مانتے ہوئے زندگی بسر کر دیتا ہے۔ اسے خود کبھی کسی سے احکام منوانے کا موقع نہیں ملتا۔ وہ دوسروں کو جھک کر سلام کرتا رہتا ہے مگر اسے کوئی سلام نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کو اپنی حقیقت کبھی معلوم نہیں ہو سکتی۔ وہ نہیں جان سکتے کہ قدرت نے انھیں بادشاہ پیدا کیا تھا۔

بعض لوگ یہ سن کر خوش ہوتے ہیں کہ لوگ انھیں منکسر المزاج کہتے ہیں۔ انھیں معلوم نہیں ہوتا کہ یہی انکسار ان کا دشمن ہے۔ گو انکسار اچھی عادت ہے مگر وہ انکسار جس سے یہ احساس پیدا ہو کہ میں پیدائشی ناقابل، بدقسمت اور ذلیل ہوں، انکسار نہیں پست خیالی ہے جو کبھی ابھرنے نہیں دیتی۔ وہ جب تک اس ڈائن سے پیچھا نہ چھڑائیں گے اور نااہلیت و ناکامی کے خیالات کو دماغ پر مسلط رہنے کی اجازت دیں گے ترقی نہ کر سکیں گے۔

میں ایک تاجر کو جانتا ہوں جس نے خاصے سرمایے سے کام شروع کیا۔ وہ تعلیم یافتہ اور ہوش مند تو تھا مگر جب کبھی مجھے اس سے ملنے کا اتفاق ہوتا وہ یہی

روتا رہتا کہ وہ کامیاب تاجر نہیں بن سکتا کیونکہ وہ اصولِ تجارت سے نابلد ہے وہ تقریباً ہر سال کہتا "مجھے اس سال بھی خسارہ ہوگا۔" اور اُسے واقعی اُس سال خسارہ ہوتا۔ اس کے دل و دماغ پر ناکامی کے بھوت نے قابو پا رکھا ہے۔ اُس کے خیالات نے اُسے کہیں کا نہ رکھا۔ وہ آج بازار میں سب سے زیادہ ناکام تاجر ہے جب اُس کے اکثر ساتھیوں نے معمولی سرمایے سے کام شروع کیا اور آج بازار میں اُن کا سکّہ چلتا ہے۔

وہ لوگ جو اپنے آپ کو فروتر سمجھتے ہیں جب کسی تقریب میں شامل ہوتے ہیں تو سب کی نظروں سے بچ کر بیٹھتے ہیں۔ اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتے۔ بے جا شرم کرتے ہیں۔ دفتر کے دروازے پر کوئی جگہ نہیں دیکھ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ وہ دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ نہ اُن کے وجود سے انسانیت کو کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ یہ دب کر رہنے والے نوجوان ملک و ملّت کے لیے بارِ عظیم ہیں۔ وہ دنیا میں چلتی پھرتی نعشیں ہیں جن کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

جو تعلیم یافتہ آدمی دفتر میں کلرک بھرتی ہوتے ہیں اور کلرک ہی ریٹائر ہوتے ہیں وہ اُن اَن پڑھ کسانوں سے بہتر نہیں جو کسی کی زمین کاشت کر کے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ ان کا تعلیم یافتہ ہونا کسی کام کا نہیں۔ جو علم خدا کی دی ہوئی قوتوں کے انکشاف میں مدد نہ دے وہ علم نہیں جہالت ہے۔ ایسے لوگ کسی عزت کے مستحق نہیں۔

ہمارے اخلاق کا سارا نظام بلند خیالی کا رہینِ منت ہے۔ پست خیالی سے ہمارے جوہرِ انسانیت رائیگاں جاتے ہیں۔ پست خیالی ہمیں عزت کی بلندیوں تک

پہنچنے سے روکتی ہے۔ بسا اوقات گناہ کی پست ترین گہرائیوں میں گراتی ہے۔ پست خیال انسانوں کے پاس جب گناہ، لذاتِ دُنیوی اور عیش کی پریاں رنگین ملبوس پہنے آتی ہیں تو ان کے جذباتِ حرص و آز بیدار ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دنیا میں آسودگی سے رہیں۔ اگر آپ صحت اور دولت کے متمنّی ہیں تو دل کو بُرے اور پست خیالات سے پاک رکھیے۔ ناامیدی کے خیالات کو پاس نہ پھٹکنے دیجیے۔ ڈاکٹر مارڈن کہتے ہیں "آپ دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ پنسل ہاتھ میں لیے آپ کے ڈرائنگ روم کی دیواروں پر لکھ رہا ہے اور سامانِ آرائش کو بگاڑ رہا ہے۔ آپ فوراً اس کے ہاتھ سے پنسل چھین لیتے ہیں اور اسے فہمائش کرتے ہیں کہ وہ اس بُری حرکت سے باز رہے مگر آپ پست خیالات کی پنسل سے اپنے جسم کی دیوار پر لکھ رہے ہیں اور روح کی شادمانی کا قیمتی سامان بگاڑ رہے ہیں۔ کبھی اس کے متعلق بھی غور کیا؟ غالباً کبھی نہیں۔ ہم معمولی معمولی باتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ معمولی نقصان پر بگڑتے ہیں مگر خود اپنی قبر کھودتے اور اپنے مستقبل کو تباہ کرتے وقت تکلیف محسوس نہیں کرتے۔ ہم میں سے بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ صرف خیالات کی غلط روی سے ہم صحت سے محروم رہتے ہیں۔ ہمارے چہروں پر جھریاں پڑ جاتی ہیں اور ہمارا گوشت پوست گل سڑ جاتا ہے۔ میرے وطن کے بیشتر نوجوانوں کو معلوم ہی نہیں کہ وہ بلند خیالی سے اپنی زندگی بنا سکتے ہیں۔ خود اعتمادی سے بلند مرتبے حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ خیال کی قوت کے قائل ہی نہیں اور خیال کی قوت سے کام لینے والوں کو شیخ چلّی کہہ کر خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ دونوں ہاتھوں میں غلط خیالات کی پنسل لیے اپنی تباہی میں

مصروف ہیں۔

اگر میں ڈاکٹر ہوتا تو ہر مریض سے بیماری کے متعلق استفسار کرنے کے بجائے یہ پوچھتا کہ وہ پست خیالی کے مرض میں مبتلا تو نہیں ؟ اور اگر وہ جواب دیتا کہ یہ عارضہ اسے ضرور لاحق ہے تو میں کبھی اس کا علاج نہ کرتا۔ گو میرا یہ طرز عمل میری پست ہمتی پر دال ہے لیکن اس بات کا کیا علاج کہ پست خیال مریضوں کو کوئی دوا شفا نہیں بخش سکتی۔

اگر آپ ترقی کے طلب گار ہیں، کامیابی کے خواہاں ہیں، آپ کاروبار میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں یا ملازمت میں، کارخانے کے مالک بننا چاہتے ہیں یا ریاست کے وزیر اعظم بننے کے خواہاں ہیں تو بلند خیال بنیے۔ نگاہ بلند رکھیے اور مصروف عمل ہو جائیے۔ پھر دیکھیے کامیابی کس طرح آپ کے قدم چومتی ہے۔ یقین جانیے اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات آپ کو کامیاب ترین انسان بنا سکتے ہیں تو نیک ترین انسان بھی۔

۲۔ اپنے آپ کو پہچانو

جب یونان میں ڈیلفی کی عمارت تیار کی گئی تو سات حکماء کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ ایسا کتبہ منتخب کریں جو دروازے پر کندہ کیا جائے۔ ان حکما نے کئی دن کے غور و خوض کے بعد یہ کتبہ منتخب کیا "اپنے آپ کو پہچانو" اور حقیقت میں اپنے آپ کو پہچاننا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ قدرت نے ہمیں اشرف خلائق بنایا ہے۔ ہمیں ان گنت خوبیاں دی ہیں۔ ہمیں خلافتِ ارض کا اہل سمجھا۔ اگر ہم جان لیں کہ ہماری حیثیت کیا ہے، ہم کیا کچھ کر سکتے ہیں اور ہم سے کن کارہائے نمایاں کی توقع ہو سکتی ہے تو ہم اپنی حالت بہتر بنا سکتے ہیں۔ نوعِ انسان کے کام آ سکتے ہیں اور خدا کی کائنات کو خوبصورت بنا سکتے ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

ز انجم تا بہ انجم صد جہاں بود	خرد ہر جا کہ پر زد آسماں بود
ولیکن چوں بخود نگریستم من	کرانِ بیکراں در من نہاں بود

اور انسان کرانِ بیکراں ہی تو ہے۔ اس نے زمین سے مدفون خزانے کھود نکالے۔ پہاڑوں کی ناقابلِ گذر چوٹیوں تک پہنچا۔ سمندر کو رام کیا اور فضائے آسمانی میں پرواز کرکے رہا۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ کائنات اس کے لیے بنائی گئی ہے اس لیے وہ سب کو اپنے بس میں لانے کی جد و جہد کرتا ہے "میں اس کائنات

کا مالک بنا یا گیا ہوں اس لیے اُنھیں میرے سامنے سجدہ کرنا چاہیے۔ میری برتری تسلیم کرنی چاہیے اور میرا فرمان ماننا چاہیے" اس احساس نے اس کا حوصلہ بلند کیا اور اسے طاقت بخشی جس کے طفیل وہ بحر و بر پر حکومت کرنے کے قابل بنا۔

نسلِ انسانی کی ترقی اور فتوحات کا سہرا ان لوگوں کے سر ہے جنھوں نے اپنے آپ کو پہچانا۔ اپنی جبلتوں اور قابلیتوں سے کام لیا اور انسانیت کے لیے مفید ایجادیں اور عمدہ اختراعیں کیں۔ آج دنوں کا فاصلہ گھنٹوں میں طے کیا جاتا ہے بجلی کے قمقموں سے ہمارے مکان بقعۂ نور بنے ہوئے ہیں۔ ریڈیو ہماری خدمت انجام دے رہا ہے تو ان لوگوں کی عنایت سے جنھوں نے برسوں دماغ سوزی کی۔ ان ایجادات کے لیے خواب و خور حرام کیا اور لگاتار محنت سے گر گر کر اُٹھے پھر مصروفِ سفر ہوتے اور ناکام ہو کر آگے بڑھنے سے اپنی منزل تک پہنچے۔ ریڈیو کے موجد کو یقین تھا، اپنی ذات پر کامل اعتماد تھا کہ وہ دنیا کو یہ نعمت دے سکتا ہے، ریڈیو تیار کر سکتا ہے۔ یہی کیفیت دوسرے موجدوں کی تھی اس لیے کامیاب ہوئے۔ انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے آپ کو پہچانا۔ یہ معلوم کیا کہ قدرت نے اُنھیں کیوں پیدا کیا، کس کام کے قابل بنایا اور وہ نوعِ انسان کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ایجاد کے پیچھے پڑ گئے۔ وہ کئی بار ناکام ہوئے کئی ٹھوکریں کھائیں لیکن شکست تسلیم نہ کی، ہتھیار نہ ڈالے، محض اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو پہچان چکے تھے، انھیں یقین تھا کہ جس کام کے انجام دینے کا عہد کر چکے ہیں اس میں کامیاب ہو کر رہیں گے، ان کی ناکامی کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہو گی اور

وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر رہے۔

موجدوں کی طرح وہ لوگ جنھوں نے اقوام و ملل کو آزادی دلائی، بیماریوں اور وباؤں پر فتح حاصل کرنے کی کوشش کی، نئے ممالک دریافت کیے سب اپنی ذات پر بھروسا رکھتے تھے۔ سب جانتے تھے کہ قدرت ان پر مہربان ہے۔ ان سے یہ کام لینا چاہتی ہے اس لیے کامیابی یقینی ہے۔ انھیں دوسروں نے منع کیا کہ اپنا قیمتی وقت اور سرمایہ ان چیزوں کی دریافت اور ان باتوں کے معلوم کرنے میں صرف نہ کریں جن کا وجود نہیں جن کا منصۂ شہود پہ آنا محال ہے جن کا ہمارے بزرگوں نے ذکر تک نہیں کیا لیکن وہ نہ مانے۔ وہ جانتے تھے کہ انسانی عقل ہر دور میں معجزے دکھا سکتی ہے۔ جو کچھ سوچا جا چکا ہے وہ کافی نہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ بزرگوں نے جہاں کام کو چھوڑا ہے اس سے ہم شروع کر دیں۔ انھوں نے جو کچھ معلوم کیا، جو کچھ دریافت کیا، اسے بنیاد قرار دے کر تحقیق و تفحص کریں اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ اس حقیقت کی نقاب کشائی کریں جس کا پردہ اٹھانے کی کوشش ہمارے بزرگ کر چکے ہیں۔ وہ کامیاب نہیں ہوئے تو حرج کیا ہے، وہ ہمیں راستہ تو دکھا گئے ہیں، ہم اس پہ چل کر منزل تک پہنچ کے رہیں گے۔ اس یقین نے ان کی مدد کی۔

انسانی زندگی میں وہ لمحہ بہت قیمتی ہے جب انسان اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے۔ اپنی حقیقت سے آشنا ہو جاتا ہے اور اس پہ اپنی عظمت کے اسرار کھل جاتے ہیں۔ لائل کہتا ہے "خوش نصیب ہے وہ انسان جس نے اپنا کام پا لیا"۔ کام پا لینے سے لائل کی مراد یہ نہیں کہ وہ کہیں ملازم ہو گیا یا اسے بیکاری اور

بے روزگاری سے نجات مل گئی۔ پیٹ پالنے کے لیے بُرے بھلے کام مل جانے کو
کام پانا نہیں کہتے، نہ اس کے پانے والے کو خوش نصیب سمجھا جاسکتا ہے۔ لائق
کا مدعا یہ ہے، جو انسان معلوم کر لیتا ہے کہ قدرت نے اسے کس کام کے لیے پیدا
کیا یا اس میں کس کام کے انجام دینے کی اہلیت موجود ہے اور اسے پایۂ تکمیل پر پہنچانے
کی کوشش کرتا ہے وہ خوش نصیب ہے کیونکہ اس میں اس کی کامیابی یقینی ہے
اور وہ اپنے جوہر دکھا سکے گا۔

بہت سے نوجوان برسوں ترقی سے محروم رہتے ہیں۔ ان کی ناکامی کا واحد
سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو نہیں پہچانتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی خاطر یہ
کام کوئی اور انجام دے اور انھیں بتائے کہ وہ کون سا کام کرنے کے اہل ہیں۔
ان کا کہنا ہے اگر ہمیں ایک بار یہ معلوم ہو جائے کہ ہم کونسی مہم دوسروں سے بہتر
طور پر سر کر سکتے ہیں تو اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا
رکھیں گے۔ یہ نادان اتنا نہیں جانتے کہ وہ جو کچھ ہیں اسے خود بخوبی جانتے ہیں۔
اگر نہیں جانتے تو ان کا اپنا قصور ہے۔ انھیں کوشش کرکے خود شناسی کی
دسترس حاصل کرنی چاہیے۔ دوسرے ہمیں راستہ تو دکھا سکتے ہیں، ہماری ایک
جھلک دیکھ سکتے ہیں اور ہمیں کسی قدر پا سکتے ہیں لیکن ہمارا اتمام و کمال ہمیں پر روشن
ہو سکتا ہے۔ ہمارے اُستاد، ہمارے اکابر ہماری حقیقت معلوم کرنے میں ہمارا
ہاتھ تو بٹا سکتے ہیں لیکن اہم پارٹ ہمیں خود ہی ادا کرنا پڑے گا۔ دانشوروں کے نصائح
اور اچھی کتابیں مشعلِ راہ کا کام تو دے سکتی ہیں لیکن منزل کا تعین اور اس تک پہنچنا ہمارا
اپنا فرض ہے مشعل کا نہیں اس لیے اپنی حقیقت معلوم کرنا ہے تو اس کی تکلیف

خود ہی گوارا کیجیے۔ بڑے لوگوں کے سوانح حیات ضرور پڑھیے۔ اساتذہ اور اکابر کے مشورے غور سے سُنیے۔ بڑے لوگوں میں سے کسی ایک کی شخصیت کو نمونہ بنایئے لیکن نقال نہ بنیے۔ نقل مطابق اصل تو ہو سکتی ہے مگر اصل نہیں بن سکتی۔ ایکٹر مشاہیر کا روپ بھر سکتے ہیں، نپولین اور ہٹلر کے روپ میں سٹیج پہ جلوہ گر ہو سکتے ہیں لیکن کارزارِ حیات میں نپولین تو کیا اس کے کسی جاں نثار کی خاکِ پا بننا بھی ان کے بس کی بات نہیں۔ بڑے لوگوں کی زندگی سے سبق حاصل کرنا ہے تو یہ دیکھیے کہ وہ کس خود اعتمادی، جرأت اور اسی قسم کے دوسرے فضائل کے مالک تھے۔ ہم ان سے حبِّ وطن، انسانیت دوستی اور مشکلات سے جنگ کرنے کا سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ جب ناکام ہونے لگیں اور یہ فیصلہ کرنے کو ہوں کہ ہتھیار ڈال دیے جائیں۔ تو بڑے لوگوں کے عزم و استقلال کے واقعات پڑھ کر حوصلہ قائم کیجیے۔ اپنے قلب کو گرمایئے۔ جب کسی مسئلے پر غور کرتے کرتے تھک جائیں۔ جی چاہے کہ کامیابی کو ناممکن سمجھ کر مزید غور و خوض کو بے سود سمجھیں تو نیوٹن۔ ڈارون اور برنارڈ شا سے مشورہ کیجیے۔ ان سے پوچھیے کیا وہ ایسے مواقع پر دل چھوڑ بیٹھتے تھے؟ اگر ان کے سوانح حیات بتائیں کہ وہ پھر کوشش کرتے تھے تو آپ بھی ان کی تقلید کیجیے۔ بندر کی طرح نقل کو شعار نہ بنایئے بلکہ اُن سا بننے کی کوشش کیجیے اور انھیں کی طرح کار ہائے نمایاں کرنے کی ٹھان لیجیے۔

زندگی کے میدان میں داخل ہونے سے پہلے خوب غور کیجیے کہ آپ کا لگاؤ سائنس سے ہے؟ صنعت و حرفت سے ہے؟ تجارت سے ہے یا فنونِ لطیفہ سے؟ یہ فیصلہ خاصی سوچ بچار کے بعد کیا جائے اور جب ایک بار فیصلہ کر لیں کہ

آپ کا طبعی رجحان کس جانب ہے تو پھر اس میں جلد ردّو بدل نہ کیجیے۔ آپ فیصلہ کرتے ہیں کہ آپ کاروباری مزاج رکھتے ہیں اور اپنی پونجی کپڑے کے کاروبار میں لگاتے ہیں لیکن اچھی ملازمت کی پیش کش پر دکان اونے پونے بیچ دیتے ہیں۔ جب ملازمت سے دل بیزار ہوتا ہے تو ٹھیکے داری کا شوق چراتا ہے۔ ایسا انسان بالعموم ناکام رہتا ہے۔ وہ ایک کام میں مہارت حاصل کر سکتا ہے نہ دوسرے میں اور اس کی زندگی اسی نقل و حرکت میں بسر ہو جاتی ہے۔

بعض اوقات انسان اپنی مرضی کا کام کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔ کاروبار کے لیے ذہنی افتاد کے علاوہ سرمایے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر سرمایہ موجود نہ ہو تو کاروباری مزاج رکھنے کے باوجود کاروبار نہیں کیا جا سکتا۔ میں ایک بار اس موضوع پر ایک دوست سے مبادلۂ خیالات کر رہا تھا۔ وہ کہنے لگے: "یہ کہنا آسان ہے کہ وہی کام کیا جائے جس سے دلی مناسبت ہو لیکن عملی طور پر ایسا کرنا سہل نہیں۔ بعض ایسی دشواریاں راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں جن کا دُور کرنا اپنے بس کی بات نہیں ہوتی۔ انھیں میں سے ایک سرمایے کا نہ ہونا ہے۔ جو انسان سرمایہ نہ رکھتا ہو وہ کاروبار کیونکر کر سکتا ہے اور تجارت کا خیال کس طرح دل میں لا سکتا ہے؟" بظاہر یہ دلیل معقول ہے۔ کاروباری ذہنیت کس کام کی جب کاروبار کے لیے روپیہ موجود نہیں لیکن بھولیے نہیں کہ دنیا میں ایسے انسان موجود ہیں جو کاروبار کے لیے سرمایہ نہ رکھتے تھے مگر آج کروڑپتی اور ان میں سے بعض ارب پتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ وہ کیونکر کامیاب ہوئے؟ راک فیلر کے پاس سرمایہ نہ تھا۔

وہ کسی ادارے میں کلرک بھرتی ہوا۔ کارنیگی، فورڈ اور اسی قسم کے بہت سے اور کروڑ پتی غریب والدین کے بیٹے تھے۔ بعض تو نان و نفقہ کے محتاج تھے اس لیے دوسروں کے ملازم ہو گئے مگر آج دولت ان کی لونڈی ہے۔ ان کی کامیابی کا راز کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے دوسروں کے کارخانوں اور اداروں میں کام کرتے وقت اپنی جبلتوں سے کام لیا۔ وہ صرف پیٹ پالنے کی خاطر ملازم نہ ہوئے تھے بلکہ سرمایہ دار بننے کے لیے انھوں نے اپنے کام میں دل لگایا، جلد جلد ترقی کی منازل طے کیں جس سے ان کی مالی حالت بہتر ہوتی گئی اور استعداد بڑھتی گئی حتیٰ کہ ایک دن ایسا بھی آیا جب انھوں نے اپنا کاروبار شروع کیا۔ ابتدا معمولی تھی مگر محنت اور استقلال سے وہ انتہائی عروج پر پہنچے۔ قدرت نے انھیں کارخانہ دار پیدا کیا اور وہ اپنی حقیقت جان کر کارخانہ دار بن کر رہے۔

یہ بھی ضروری نہیں کہ کاروبار سے مناسبت رکھنے والا ہر فرد اپنا کارخانہ ہی قائم کرے۔ اس وقت دنیا میں سیکڑوں کارخانے ہیں، ان میں مشاہرے پر کام کرکے بھی اپنی محنت کی قیمت وصول کی جا سکتی ہے۔ دنیا میں ایسے بیسیوں ملازمین ہیں جو گراں قدر مشاہرے لیتے ہیں۔ بڑے بڑے کارخانوں کے مینیجر اور انجینیئر اوسط درجے کے کارخانہ داروں سے زیادہ کماتے ہیں۔ مقصد کارخانہ قائم کرنا نہیں بلکہ اپنی حالت بہتر بنانا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اگر انسان اس شعبے میں کام کرے جس سے دلی لگاؤ ہو تو اس میں ترقی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں بہ نسبت اس کے جہاں با دل ناخواستہ کام کرے۔

بلاشبہ وہ لوگ جنھیں اپنی زندگی خود بنانا پڑتی ہے، اپنے طبعی رجحان کے مطابق

کام کرنے میں دقت محسوس کرتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان پر کامیابی کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ مشاہیر میں سے اکثر ایسے ہیں جو مفلس تھے اور انھیں کامیابی کے سمندر تک پہنچنے کے لیے پُر پیچ راستوں اور طویل شاہراہوں کو عبور کرنا پڑا۔ پھر آپ کیوں ہراساں ہوں؟ اگر آپ کو کسی پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے کا اتفاق ہُوا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ چوٹی تک پہنچنے کے لیے بھی بار بار رُخ بدلنا پڑتا ہے۔ کوئی بندھا ضابطہ ایسا نہیں جسے میدانِ حیات میں داخل ہونے سے پہلے ہی سامنے رکھ لیا جائے۔ آپ یہ ارادہ تو کر سکتے ہیں کہ میں کامیاب انسان بنوں گا۔ شاید یہ فیصلہ بھی کر لیں کہ فنِ تعمیر میں کمال حاصل کروں گا لیکن کمال حاصل کرنے کے لیے کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور آپ ان پر کیونکر قابو پائیں گے۔ اس کا فیصلہ تو اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب مراحل پیش آئیں گے۔ کیونکہ آپ جان ہی نہیں سکتے کہ آج سے پانچ سال بعد حالات کیسے ہوں گے اور آپ انھیں موافق کس طرح بنائیں گے۔ پس سفرِ حیات شروع کرتے وقت جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ حوصلہ بلند رکھیں، محنت و مشقت کے عادی بنیں، اپنے آپ کو بدقسمت نہ سمجھیں، اپنے آپ میں یہ اعتماد پیدا کریں کہ آپ کامیاب ہوں گے اور اس روش پر چل نکلیں جو پسند ہے اور جس کے متعلق آپ کو یقین ہو کہ منزلِ مقصود کی طرف جاتی ہے۔ پھر کامیابی ہوگی۔

ہمارے یہاں ایسے نوجوانوں کی کمی نہیں جو تقلید کو محفوظ راستہ سمجھتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے شہر کا ایک وکیل ہائی کورٹ کا جج بن گیا ہے تو وہ وکیل بننے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جج بننے کے لیے وکالت کی

ڈگری کافی ہے۔ انھوں نے یہ معلوم کرنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ وکیل سے ہائی کورٹ کا جج بننے تک کون سے مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ کچھ وکیل ایسے بھی ہیں جو ہائی کورٹ کا جج بننا نہیں چاہتے، وکیل بنے رہنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ ججوں سے کئی گنا زیادہ کماتے ہیں اور ملک و ملّت کی خدمات بجا لاکر ججوں سے زیادہ عزّت حاصل کرتے ہیں۔

انھیں وکالت سے مناسبت نہیں ہوتی لیکن سمجھتے ہیں کہ جب اسی شہر کے ایک اور وکیل نے اتنی ترقی کی ہے تو وہ کیوں نہ کر سکیں گے۔ وہ وکیل بن جاتے ہیں لیکن ترقی نہیں کر سکتے۔ سالہا سال تک وکالت کرنے کے بعد بھی ان کی مالی حالت نہیں سدھرتی تو بددل ہو کر بُری بھلی ملازمت کر لیتے ہیں۔ وہ کبھی جج نہیں بن سکتے اور کبھی شہرت کی بلندیوں تک نہیں پہنچتے۔ وہ کیوں ناکام ہوتے ہیں؟ محض اس لیے کہ انھوں نے کسی اور کی دیکھا دیکھی وکیل بننے کا فیصلہ کیا، اپنے ضمیر سے نہ پوچھا کہ کیا بننا چاہیے اور وکالت میں کامیابی کے اصولوں کی پیروی نہ کی، صرف "مسند وکالت" حاصل کرنے کو کامیابی سمجھا۔

جب ہمارے علاقے کے ایک ہونہار نوجوان نے وکیل بننے کا فیصلہ کیا تو اُس سے کسی نے دریافت کیا کہ اُس نے وکالت کو باقی تمام شعبوں پر کیوں ترجیح دی ہے۔ اس نوجوان نے بتایا کہ وہ وکیل بننے کے بعد ضلع کی سیاسیات میں اسی طرح حصّہ لینا اور کامیاب ہونا چاہتا ہے جس طرح فلاں وکیل کامیاب ہُوا ہے۔ اُن دنوں ایک وکیل کا طوطی بول رہا تھا۔ قانون دان کی حیثیت سے نہیں بلکہ سیاست دان ہونے کے لحاظ سے ضلع کا بچّہ بچّہ انھیں جانتا تھا۔ وہ اس

قبیلے کے مسلّمہ لیڈر تھے جسے ضلع میں اکثریت حاصل تھی اس لیے ان کی دھاک بندھی ہوئی تھی جسے چاہیں ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ بنوا دیں، جسے چاہیں اسمبلی کا رکن بنوا دیں۔ اس نوجوان نے خیال کیا کہ مندرجہ بالا وکیل کی کامیابی وکالت کی ہی مرہونِ منّت ہے۔ اس لیے سوچے سمجھے بغیر وکیل بن گیا اور امتحان پاس کر کے بڑے ٹھاٹھ سے دکان سجائی مگر پکوان پھیکا تھا، ابھر نہ سکا۔

وکلا بالعموم آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہیں۔ انھیں جوں جوں تجربہ ہوتا جاتا ہے۔ خوش حال بنتے ہیں اور ان کے موکل زیادہ ہوتے جاتے ہیں مگر یہ وکیل گرتے گئے۔ شروع شروع میں اگر کچھ موکل آتے تھے تو بعد میں انھوں نے بھی دُور کی صاحب سلامت کو غنیمت جانا۔ آخر کار دس سال تک وکالت کا بھاڑ جھونکنے کے بعد سکول میں پناہ لی۔ آج کل وہ ایک اے۔ وی مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ دو پونے دو سو روپے ماہانہ مشاہرے پر ڈسٹرکٹ بورڈ کے ملازم، اسی ڈسٹرکٹ بورڈ کے جس کے وائس چیئرمین کی تقلید میں وکالت کو اپنے لیے پسند کیا تھا۔

اس نوجوان کی طرح ہمارے ملک کے بیسیوں ذہین اور تعلیم یافتہ نوجوان ہنگامی فیصلوں کی وجہ سے آج تک ترقی کی جھلک نہیں دیکھ سکے اور تنگی ترشی میں وقت بسر کر رہے ہیں۔ اس کی ذمہ داری کسی حد تک اس نصابِ تعلیم پر بھی ڈالی جا سکتی ہے جو پاکستان کے سابقہ حکمرانوں نے تیار کیا تھا۔ انھیں کلرکوں کی ضرورت تھی، اپنی قدر و قیمت جاننے والے عقل مند پاکستانی افسروں اور مدبروں کی نہیں اس لیے ہمارے واسطے ایسا نصابِ تعلیم تجویز کیا جو ہمیں اپنی قدر و قیمت معلوم کرنے میں مدد نہیں دیتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بہت سے نوجوان خود شناسی کی ضرورت

ہی محسوس نہیں کرتے۔ انھیں بتائیے کہ خودشناسی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ تو وہ حیرت سے آپ کا منہ دیکھنے لگیں گے۔ وہ اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن ہیں۔ ایک سرکاری دفتر میں ملازم ہیں۔ ڈیڑھ دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ ریٹائر ہونے تک اڑھائی تین سو کے گریڈ میں پہنچ جائیں گے اور سو سوا سو روپے پنشن لے لیں گے اس سے بڑھ کر اور خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے؟ اگر ان کی پست ہمتی اور خود ناشناسی کا نقصان صرف ان کے وجود کو پہنچتا تو شاید ہمیں خودشناسی کی تبلیغ کی ضرورت محسوس نہ ہوتی لیکن مشکل یہ ہے کہ جس ملک کے نوجوانوں کی پستیِ ہمت کا یہ عالم ہو۔ وہ ترقی نہیں کر سکتا۔ اس لیے ہم اربابِ تعلیم سے کہیں گے کہ وہ غلامی کے دور کا نصاب تعلیم جلد تبدیل کریں اور پاکستانی نوجوانوں سے مطالبہ کریں ۔ کہ وہ پستی کے خیالات چھوڑ دیں اور اپنے اور اپنے وطن کے لیے مفید بننا سیکھیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ دنیا کا امیر ترین ملک ہے۔ دُنیا کی دو عظیم لڑائیوں کا رُخ صرف امریکہ کے قابل جرنیلوں نے نہیں پلٹا بلکہ ان صناعوں، کارخانہ داروں اور محنت کشوں نے بھی اس میں پورا حصہ لیا جنھوں نے لڑنے والی سپاہ کے لیے اسلحہ اور ضروری سامان تیار کیا۔ امریکہ کی عظمت کا سہرا لنکن، روزویلٹ، ولسن اور ٹرومین کے سر ہی نہیں۔ کارنیگی، راک فیلر اور فورڈ کے سر بھی ہے۔ جنھوں نے اپنے کارخانوں میں سامان تیار کر کے امریکہ کو امیر بنایا، اس قدر امیر کہ ترقی یافتہ یورپ امریکہ کی امداد کا محتاج ہے۔ امریکہ کو صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ بنانے میں ان مفلس نوجوانوں نے بڑا حصہ لیا جو خودشناس تھے، ذہین تھے، محنتی تھے۔ وقت کی اہم ضرورت ہے کہ پاکستان کے نوجوان بھی زندگی کا رُخ روشن

دیکھیں، اپنے آپ کو پہچانیں، ان قابلیتوں کو جو ان کے نہاں خانۂ دماغ میں سوئی پڑی ہیں جھنجھوڑیں، جگائیں، اپنا اندرونی خزانہ کھود نکالیں۔ پھر وہ خود ہی مالا مال نہ ہوں گے بلکہ وطن عزیز کی توقیر کا باعث بھی بنیں گے۔

اس وقت ان کی حالت اس نوجوان شیر کی سی ہے جو بھیڑوں کے گلّے میں پلنے کی وجہ سے اپنے آپ کو بھیڑ سمجھتا رہا۔ وہ بھیڑوں سے مل کر گھاس چرتا اور انھیں کی طرح گیدڑ کو دیکھ کر بھاگ جایا کرتا۔ یہ شیر اس وقت تک بھیڑ بنا رہا جب تک اسے معلوم نہ ہوا کہ وہ شیر ہے۔ وہ گیدڑوں اور کتوں سے قوی تھا۔ وہ انھیں دیکھ کر اس لیے نہ بھاگتا تھا کہ وہ اس شیر سے زیادہ طاقت رکھتے تھے بلکہ محض اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو ان سے کمزور جانتا تھا۔

ایک روز اس نے سامنے کی پہاڑی پر ایک شیر کی گرج سُنی تو وہ جاگ پڑا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس قسم کا نعرہ تو وہ بھی بلند کر سکتا ہے۔ اس کے اندر کا سوتا ہوا شیر بیدار ہو گیا اور اس نے پوری قوت سے اس نعرے کا جواب دیا۔ وہ اپنی استعداد پر بڑا حیران ہوا۔ اس نے بھیڑوں کی طرف تعجب سے دیکھا اور بھیڑیں بھی اسے خوفزدہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ اُس وقت اُسے معلوم ہوا کہ وہ اُن میں کا نہیں۔ وہ ان کے قبیلے کا رُکن نہیں۔ وہ شیر ہے۔ کتوں، بھیڑوں اور گیدڑوں سے ڈرنے والا نہیں بلکہ جسے دیکھ کر جنگل کے تمام جانوروں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اگر تساہل پسند، کم ہمت اور ڈرپوک نوجوان اس شیر کی طرح اپنے اندر کے سوتے ہوئے قوی ہیکل انسان اور مردِ دانا کو جگا لیں تو ان کی موجودہ حالت اقبال مندی اور خوش حالی میں بدل سکتی ہے۔ اگر ملازمت کو ذریعہ عزت سمجھنے والے

نوجوانوں کو معلوم ہو جائے کہ فطرت نے انھیں وہ نہیں بنایا جو اس وقت دکھائی
دیتے ہیں بلکہ اس نے انھیں دولت مند پیدا کیا ہے۔ عقل و فہم دی ہے۔ بصیرت
بخشی ہے۔ زندگی کا گرم لہو اور تُند موجوں سے لڑنے اور طوفانوں کا مقابلہ کرنے
کی قوت دی ہے تو وہ موجودہ پست حالی پر کبھی قانع نہ رہیں۔ اس میں شک نہیں کہ
بھیڑوں میں پلنے والے نوجوان شیر کی طرح وہ غلامی کے ماحول میں پیدا ہوئے،
پلے، وہی تعلیم حاصل کی جسے ان کے سفید فام آقاؤں نے ان کی خودی کے قتل
کرنے کے لیے مناسب سمجھا مگر اب وہ دور گزر چکا ہے، اب وہ نفیرِ آزادی سن چکے
ہیں، پھر اب کیوں بھیڑ بنے رہنے پر قانع رہیں؟ اس طرح کیوں سوچیں جیسے وہ
غلامی میں سوچا کرتے تھے؟ اپنے اندر کے اس عظیم انسان کو کیوں نہ جگائیں جو مدت
سے محوِ خواب ہے؟ اس خزانے کو کیوں برآمد نہ کریں جو جسم کی چار دیواری میں
مدفون ہے؟

ولیم جیمز کہتے ہیں کہ عام انسان اپنی پوشیدہ ذہنی قوتوں کے صرف دس
فی صد حصے کو ترقی دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "ہم اپنے جسمانی اور ذہنی خزانوں کا بہت
کم حصہ استعمال میں لاتے ہیں، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ انسان بہت کم سرمایے
پہ گزارہ کرتا ہے۔ اس کے اندر بہت سی قوتیں ہیں جنھیں کام میں لانے سے وہ عادتاً
گریز کرتا ہے۔" اس حقیقت کی تصدیق وہ لوگ کرتے ہیں جو تخلیقی قوتوں سے پوری طرح
کام نہیں لیتے اور اپنی پوری قیمت وصول نہیں کرتے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے وطن
کے نوجوان اپنی تخلیقی قوتوں سے کام لینا سیکھیں۔ اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھیں بلکہ عالی نسب
جانیں اور اپنی اور اپنے وطن کی ترقی کے لیے جدوجہد کریں۔ خود بڑا بنیں اور وطن

کو بڑھا بنائیں۔

آپ اس آدمی کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے جس کے گھر کے سامنے میٹھے پانی کا کنواں موجود ہے مگر وہ جوہڑ کا پانی اس لیے پیتا ہے کہ کنوئیں میں ڈول ڈال کر پانی کھینچنے کی تکلیف کون گوارا کرے ؟ آپ اسے احمق سمجھیں گے لیکن اس انسان کے متعلق آپ کا فیصلہ کیا ہے جسے قدرت نے امیر پیدا کیا ہے ، خزانے بخش رکھے ہیں مگر وہ اس خزانے کو حاصل کرنے کی اس لیے کوشش نہیں کرتا کہ محنت کرنا پڑتی ہے ۔ وہ گھٹیا درجے کی ملازمت پاکر خوش ہے اس لیے کہ یہ راہ بے خطر ہے ، ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو بندھی بندھائی رقم مل جاتی ہے ، کیا آپ اسے عقل سلیم سے محروم نہ سمجھیں گے ؟ میں نہیں چاہتا کہ میرے وطن کا کوئی نوجوان اس حماقت کا مرتکب ہو اس لیے میں انھیں مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اپنے آپ کو پہچانیں ، اپنی قدر و قیمت جانیں ، سونا تلاش کرنے والوں کی طرح استقلال سے کام لیں اور خداوند نے انسان کے لیے جو نعمتیں پیدا کی ہیں ان میں سے اپنا حصہ ضرور حاصل کریں۔

۳۔ خود اعتمادی

جن لوگوں نے افلاس کی گود میں آنکھ کھولی، جو غریبی کے گہوارے میں پروان چڑھے مگر انھوں نے ذاتی جدوجہد اور سعی سے بلند ترین مناصب حاصل کیے، ان کے سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام کامیابیوں کا انحصار اٹل خود اعتمادی پر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی ذات پر مکمل اعتماد انسان کو مایوسی کے حملوں سے بچاتا، کارزارِ حیات میں حصّہ لینے پر مستعد کرتا اور انعام حاصل کرنے کے قابل بناتا ہے۔

خود اعتمادی سے ہمیں اپنی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ ہم زندگی کے میدان میں فتح حاصل کرنے کے لیے سرگرمی سے مشغولِ کار ہو جاتے ہیں۔ ہم مصائب سے نہیں ڈرتے خطرات کی پروا نہیں کرتے اور ہمیں یقین ہوتا ہے کہ مصائب کے ان تاریک بادلوں کے پیچھے کامیابی کا ستارہ چمک رہا ہے۔

اکبرِ اعظم کی طاقت، و جبروت سے کسے انکار ہے لیکن ملکہ چاند بی بی نے اس کے سامنے سرنگوں ہونے اور اس کے تفوق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ جبھی تو وہ شاہی افواج کے مقابلے پر تیار ہو گئی اور اس نے جس عدیم النظیر جرأت و بسالت سے شاہی افواج کا مقابلہ کیا۔ اس کی نظیر تاریخ عالم میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

ملکہ چاند بی بی شمشیر برہنہ ہاتھ میں لیے خطرات کے مقامات پر پہنچتی اور فوج کا دل بڑھاتی رہی۔ آخر کار شہزادہ سلیم نے جو شاہی افواج کا کمانڈر تھا، سمجھ لیا کہ احمد نگر کا سر کرنا دشوار ہے۔ اس لیے ملکہ ممدوحہ سے بخوشی صلح کر لی۔ ملکہ چاند بی بی کی کامیابی اس امر کا بین ثبوت ہے کہ قوتِ بازو پر بھروسا کرنے والا انسان جب کچھ کرنے پر آجاتا ہے تو فتح و نصرت کے فرشتے اس کی اعانت کرتے ہیں۔

ولیم پٹ کی خود اعتمادی کی داستان بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ جب اس سے انگلستان کا قلمدانِ وزارت لے لیا گیا تو اس نے ڈیوک آف ڈیون شائر سے صاف کہہ دیا "مجھے معلوم ہے کہ اس وقت انگلستان کو صرف میں ہی تباہی سے بچا سکتا ہوں اور کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔" اور بیان کیا جاتا ہے کہ برطانیہ کی کرسیٔ وزارت مسلسل گیارہ مہینوں تک خالی پڑی رہی۔ بالآخر شہنشاہ برطانیہ اور دیگر مدبرین کو پٹ کی فوقیت تسلیم کرنی پڑی اور عنانِ وزارتِ عظمیٰ پھر اس کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ ولیم پٹ کو اپنی ذات پر بھروسا تھا اور حق یہ ہے کہ اس کے اعتمادِ نفس ہی نے مدبرینِ برطانیہ کو اس کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر دیا۔

مارڈن کہتا ہے "خود اعتمادی وہ طاقت ہے جو پہاڑوں کو اکھاڑ پھینکتی ہے" تاریخ میں ایسی شہادتیں اکثر ملتی ہیں کہ مفلس اور کمزور آدمیوں نے اپنی قوتِ بازو پر بھروسا کر کے حیرت انگیز ترقی کی اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کی قسمت کے مالک بنے۔ خود اعتمادی نے انھیں اس قابل بنایا کہ وہ بڑی بڑی مہمیں سر کرنے میں کامیاب ہوئے اور ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔

مرد کی شان سے بعید ہے کہ وہ حوادث و خطرات سے ڈر جائے اور اپنے

آپ کو تفکرات و یاس کا شکار بنالے۔ حضرت جوشؔ کیا خوب کہتے ہیں :

مرد کی تخلیق ہے زور آزمانے کے لیے
گردنیں سرکش حوادث کی جھکانے کے لیے
مرد ہے سیلاب کے اندر اکڑنے کے لیے
بحر کی بپھری ہوئی موجوں سے لڑنے کے لیے.

مرد کون ہے؟ حضرت جوشؔ سے سنیے :

جنگ میں ہو بانکپن جس کی شجاعت کا گواہ
رزم کے شعلوں میں کج کرتا ہو ماتھے پر کلاہ
دوڑتا ہو شعلہ خو بجلی کا دامن تھامنے
مسکراتا ہو گرجتے بادلوں کے سامنے

مگر انسان میں یہ جرأت کیونکر پیدا ہو سکتی ہے ؟ جب اسے اپنی ذات پر بے پناہ اعتماد ہو۔

کامیابی حاصل کرنے کے لیے مشکلات کا مقابلہ ناگزیر ہے۔ اگر دنیا میں بدی کا وجود نہ ہوتا تو نیکی کا لفظ شرمندۂ معنی نہ ہوتا۔ انسان مصائب کی بھٹی میں کود کر ہی کندن بنتا ہے۔ مشکلات ہماری مخفی قوتوں کو ابھارتی ہیں اور ہمارے اصلی جوہر ظاہر کرتی ہیں۔ اس لیے ہمیں ہمیشہ مشکلات کے مقابلے میں سینہ سپر رہنا چاہیے۔ تساہل پسندی خود اعتمادی کے منافی ہے۔ ساحل پہ بیٹھ کر لہریں گننے سے موتیوں تک ہماری رسائی نہیں ہو سکتی۔ نہ اس طرح ہم زندگی کے امتحان میں پورے اتر سکتے ہیں۔ بمصداق :

میا آرا بزم بر ساحل کہ آنجا — نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز — حیاتِ جاوداں اندر ستیز است (اقبال)

جنگ کو نوعِ انسان کا مہیب دشمن خیال کیا جاتا ہے لیکن جنگ خود اعتمادی کے علاوہ صداقت، امن اور راستی کی بھی مظہر ہے۔ جنگ کیا ہے؟ چند خطرات کا مجموعہ جو ملکوں اور قوموں کو پیش آتے ہیں اور اپنی ذات پر مکمل اعتماد کے بغیر ہم اس جلتی ہوئی بھٹی میں نہیں کود سکتے۔ حق و باطل کی تمیز کے لیے ہم لڑنے پر مجبور رہیں۔ بغیر جنگ کے بدی کا استیصال ناممکن ہے۔ کیا انبیا ربدی کی قوتوں کے خلاف برسرِ پیکار نہیں رہے؟ کیا یزداں اہرمن کے خلاف نبرد آزما نہیں؟ جنگ ایک کسوٹی ہے جس پر بزدل، نامرد اور خود اعتماد کی پرکھ ہوتی ہے۔ فتح اس کا دامن چومتی ہے جسے اپنی فتح کا یقین ہوتا ہے۔ مولانا آزاد رقمطراز ہیں "اصلی قوت جذبات و حسیات کی ہے۔ آہن پوش جہازوں سے بڑھ کر ہمت کو قوی ہونا چاہیے اور قیمتی توپوں کی جگہ عزم و ارادہ کی فضا میں وسعت درکار ہے۔"

جنگ میں غیر متوقع کامیابی اور فتح کا انحصار زیادہ تر خود اعتمادی پر ہوتا ہے۔ ۱۹۱۶ء میں وِرڈن کے مقام پر فرانس نے غضبناک جرمنی کی مدافعت نفسیاتی اصول کے تحت کی۔ فرانسیسی فوج کے کمانڈر جنرل پیتاں نے اپنی سپاہ کے دل سے ڈر، خوف اور ناکامی کے خیالات نکال کر یہ آہنی اعتماد پیدا کر دیا تھا کہ "جرمنی آگے نہ بڑھے گا۔"

"وہ نہ بڑھیں گے" تمام سپاہی ان ساحرانہ الفاظ سے مسحور تھے۔ ایک فرانسیسی ڈاکٹر رقمطراز ہے کہ زخمیوں میں قابلِ ذکر شئے شکست ناآشنا قوتِ ارادی

تھی۔ ان کے چہروں سے آہنی عزم ظاہر ہوتا تھا۔ بسا اوقات زخمی سپاہی غشی کی حالت میں بھی پکار اُٹھتے تھے "وہ نہ بڑھیں گے"۔ یہی غیر مفتوح جذبہ فرانسیسی قیدیوں کے دلوں میں تھا جس نے جرمن افسروں کو متحیر کر رکھا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ فتح کا انحصار ایسے ہی شکست نا آشنا اعتماد پر ہے۔ میدانِ جنگ کا ایک نامہ نگار لکھتا ہے کہ تمام سپاہی "جرمنی نہ بڑھے گا" پر یقین رکھتے تھے جب اس نے ایک رجمنٹ کے سپاہیوں سے جو چھ دن تک اگلے مورچے میں رہ کر آرام کی خاطر واپس آئے۔ جنگ کی کیفیت دریافت کی تو سب نے بیک آواز جواب دیا "جرمنی نہ بڑھے گا" اور جرمنی فی الواقع نہ بڑھ سکا۔

زندگی کی جنگ میں فتح کا جھنڈا لہرانے کے لیے اگر آپ بھی اپنے دشمنوں تلوّن مزاجی، سہل انگاری، بزدلی اور کم ہمتی سے کہہ دیں "تم کبھی نہ بڑھ سکو گے میں اپنے دشمنوں کو دل و دماغ میں گھسنے کی اجازت نہیں دے سکتا" تو یقین جانیے پھر یہ آپ پر حکومت کرنے کے قابل نہ ہو سکیں گے اور آپ میں استقلال، جرأت اور خود اعتمادی کے جذبات پیدا ہوں گے۔

وہ آدمی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا جس کے دماغ پر ناکامی کا بھوت سوار ہے، جو اپنے آپ کو حقیر سمجھتا ہے، جو ذمہ داری کا عہدہ قبول کرنے سے ڈرتا ہے اور جسے اپنی قوتِ بازو پر بھروسا نہیں۔ الفرڈ ہنری لوئیس کہتا ہے "بے دلی سے نیکی کی حمایت کرنے کے بجائے مستقل مزاجی سے بدی کی اعانت کرنا بہتر ہے کیونکہ ڈانواں ڈول انسان گناہ کی گہرائیوں میں جلد گر جاتا ہے"۔ متلوّن مزاج انسان اگر نیک ہے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دیر تک نیک رہے گا۔ کیا معلوم کب پھسل

جائے؟ اس کے برعکس وہ انسان جو غلط کار ہے مگر ہے مستقل مزاج، اس پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ جب وہ ایک بار روشنی کی کرن دیکھے گا تو پھر شاہراہِ صداقت کو نہ چھوڑے گا۔ اس اصول کی تائید میں بالمیک رشی کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ بنی نوعِ انسان کے خون اور دولت کا یہ پیاسا ڈاکو جب ایک بار گناہ سے تائب ہوتا ہے تو تاریک ماضی کو یکسر فراموش کر دیتا ہے اور روشن مستقبل بناتا ہے۔ قرنِ اوّل کے مجاہدین کی سیرت کا مطالعہ کیجیے، ان میں سے کئی بزرگ ایسے ہیں جنھوں نے شروع شروع میں اسلام کی شدید مخالفت کی مگر جب اسلام قبول کیا تو اسلام کی خدمت کرنے میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔

اس بات کی کبھی پروانہ کیجیے کہ آپ غریب والدین کے نورِ نظر ہیں، آپ کے پاس وسیع پیمانے پر کاروبار چلانے کے لیے روپیہ نہیں یا آپ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ مسولینی، مصطفیٰ کمال اور رضا خاں نے بھی مفلس گھرانوں میں جنم لیا مگر دولت اور عزت حاصل کر کے رہے۔ راک فیلر، فورڈ اور کارنیگی کے پاس بھی کاروبار کے لیے روپیہ نہ تھا مگر کروڑ پتی بن کر رہے۔ شیکسپیئر، حافظ، کالی داس اور سر سید بھی کسی مستند یونیورسٹی سے سندِ فضیلت حاصل نہ کر سکے مگر ان کا شمار اچھے مصنفین، شعراء اور ادباء میں ہو کر رہا۔ آپ کوشش کریں، ان کی طرح محنت کو شعار بنائیں اور یقین رکھیں کہ کامیابی آپ کا پیدائشی حق ہے تو آپ بھی کامیاب ہو سکتے ہیں۔

خود اعتمادی انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ اس کے احکام پر سرِ تسلیم خم کیا جاتا ہے۔ قسمت اور تقدیر کے نوشتے اس کی خاطر تبدیل کر دیے جاتے ہیں۔ پہاڑ اس

کے راستے سے ہٹ جاتے ہیں اور دشمن انگشت بہ دہن ہو کر رہ جاتے ہیں۔ نپولین کو انجینیروں نے صاف کہہ دیا کہ کوہ ایلپس کو عبور کرنا ناممکن ہے مگر نپولین نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ اس نے جواب دیا کہ یا تو ایلپس مجھے راستہ دے گا، یا میرے راستے میں نہ رہے گا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دشوار گزار ایلپس نے اسے راستہ دے دیا۔ نپولین کی ساری زندگی معجز نما خود اعتمادی کی مثالوں سے پُر ہے جب اُس نے جزیرہ ایلبا کو چھوڑ کر سرزمین فرانس پر قدم رکھا۔ تو شاہی خاندان سراسیمہ ہو گیا اور اس کے مقابلے کے لیے ایک زبردست لشکر بھیجا۔ نپولین کے ہمراہ اس کے چند ساتھی تھے اور سامنے ایک لشکر جرّار کھڑا تھا مگر خود اعتمادی کا مجسمہ نپولین ہراساں نہ ہوا اور اُس نے بیباکانہ انداز میں اس فوج کو جو اسے گرفتار کرنے آئی تھی، خطاب کیا: "اگر تم اپنے محبوب جرنیل کو قتل کرنا چاہتے ہو تو میں اپنا سینہ پیش کرتا ہوں"۔ یہ کہہ کر اس نے کوٹ کے بٹن کھول دیے اور سینہ عریاں کر دیا۔ یہ دیکھ کر سپاہیوں کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے، انھوں نے سنگینیں نیچے کر لیں، شرم کے مارے سر جھکا لیے اور نپولین کے ساتھ آ ملے۔

ممکن ہے کہ خود اعتمادی، استقلال اور جدوجہد کے بعد بھی ہم شہرت کی بلندیوں تک نہ پہنچ سکیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہماری پیدائش کی غرض و غایت شہرت اور دولت ہی ہے؟ ہمارا ملبوس زرّیں نہیں، ہم جاہ و حشم کے مالک نہیں، پھر کیا ہے؟ فرض کا ادا کرنا بذاتِ خود ایک دولت ہے جو اکثر زر و جواہر سے کھیلنے والے امرا کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم بدی اور شیطنت کی قوتوں کے مقابل صف آرا رہیں اور نتیجے کی فکر نہ کریں۔ اپنے آپ کو عالی نسب اور فخر

انسانیت سمجھیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دولت، انسانیت کے پاس چل کر گئی ہے۔ جب سکندر اعظم کو یونانیوں نے اپنا سپہ سالار تسلیم کر لیا تو اطراف و جوانب سے امرا، حکما اور علما آتے اور اسے مبارک باد پیش کرتے مگر حکیم دیو جانس کلبی جو قریب ہی قصبہ کورنتھ میں مقیم تھا، نہ آیا۔ ایک دن سکندر اپنے سرداروں کے ہمراہ اسی نواح میں شکار کھیلنے گیا اور جب اس غار کے قریب پہنچا جہاں حکیم دیو جانس مقیم تھا تو کیا دیکھتا ہے کہ حکیم مذکور غار سے باہر بیٹھا ہوا دھوپ تاپ رہا ہے۔ سکندر اس کے قریب گیا۔ جب حکیم دیو جانس نے بہت سی بھیڑ اپنے گرد دیکھی تو اس نے لیٹے لیٹے ذرا گردن اٹھائی اور سکندر پر ایک نظر ڈالنے کی تکلیف گوارا کی۔ اس وقت سکندر نے محبت کے لہجے میں کہا کہ آپ کو کسی چیز کی خواہش ہو تو فرما دیجیے۔ دیو جانس نے جواب دیا "ہاں میں چاہتا ہوں کہ آپ سامنے سے ہٹ جائیں تاکہ دھوپ مجھ تک پہنچ سکے۔" سکندر یہ جواب سن کر اس کی عظمت کا ایسا قائل ہوا کہ ساتھیوں سے کہنے لگا "واللہ اگر میں سکندر نہ ہوتا تو دیو جانس بننے کی آرزو کرتا۔" دیو جانس میں یہ بے نیازی کیونکر آئی؟ اس طرح کہ اسے اپنی عظمت کا احساس تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ بادشاہوں سے کم معزز نہیں۔ خود سکندر کے جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاہی اور فقرِ غیور کو یکساں عزت کا مستحق سمجھتا ہے۔

"میں غریب ہوں، حقیر ہوں، میں ڈرتا ہوں کہ اس اہم کام کی تکمیل میرے ہاتھوں نہ ہو سکے گی۔ میری تعلیم اور تجربہ محدود ہے، یہ بہت بڑا کام ہے جناب بہت ہی بڑا۔" اس قسم کے فقرات بزدل نوجوانوں کے نوکِ زبان رہتے ہیں۔

وہ سمجھتے ہیں کہ قدرت نے اُنھیں پست فطرت بنایا ہے وہ زندگی کو ایک بار سمجھتے ہیں اور بُرے بھلے دن بسر کر کے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ خدا نے انھیں بڑا آدمی بنایا ہے بہت ہی بڑا۔ دیوؤں سے زیادہ طاقتور اور فرشتوں سے زیادہ مقدّس کیونکہ خدا نے انھیں بلند اور پاکیزہ فطرت دی ہے۔

افعی اپنا پھن پھیلائے ڈسنے پہ مستعد ہوں اور درندے مُنہ کھولے کھڑے ہوں جب بھی خدا اور اپنی ذات پہ بھروسا کرنے والا آدمی منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ پتی برتا بیہولا نے منشا دیوی کو اپنے خاوند کے زندہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آرلینز کی دیہاتی کنواری کو اپنے ضمیر کی الہامی آواز پہ یقین تھا کہ اس وقت صرف وہی فرانس کو بچا سکتی ہے۔ ایک ان پڑھ بھیڑوں کا گلّہ چرانے والی دیہاتی لڑکی کا یہ یہ خیال بظاہر مجذوب کی بڑ دکھائی دیتا ہے لیکن یہ امر واقع ہے کہ جان آف آرک کی قیادت میں فرانسیسی فوجوں نے دشمن کو پیچھے دھکیلا۔ تاریخ کا یہ بڑا معجزہ فوجی تربیت سے محروم لڑکی کی خود اعتمادی کا رہینِ منت ہے۔

ایک مشہور ضرب المثل ہے "خدا ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں" اور اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں۔ جب آپ کا دل وساوس کے بوجھ سے دبا ہوا ہے، آپ کو خدا اور اپنی قوت بازو پہ بھروسا نہیں، جب خطرے اور تکلیف کا نام لیتے ہی آپ کے جسم کا خون خشک ہوتا ہے تو خدا کو کیا پڑی ہے کہ آپ ایسے ننگِ انسانیت جانداروں کے لیے اپنے قوانین میں ترمیم کی ضرورت محسوس کرے؟ وہ عادل ہے اور ان کی مدد کرتا ہے جو اس کی دی ہوئی قوتوں سے کام لیتے ہیں، جو انسانیت کی بہبود کے لیے سرگرم کار ہیں، جو اس کی دُنیا کو گلشن بنانے میں کوشاں

ہیں اور جو اس کے احکام کی تعمیل میں مصروف ہیں۔ اُس نے آڑے وقت پر خالد لنکن سر سید اور گاندھی کی ہمیشہ مدد کی۔ ایک انگریزی شاعر کے قول کے مطابق بلا شبہہ "ایک آنکھ ہے جو خمارِ خواب سے کبھی بوجھل نہیں ہوتی۔ ایک کان ہے جو ہمیشہ سُنتا ہے اور ایک ہاتھ ہے جو ہمیشہ دیتا ہے مگر اُس کی کرم فرمائی صرف ان کے لیے ہے جنھیں اپنی قوت اور اپنی ذات پر بھروسا ہوتا ہے۔

کولمبس کو اپنی ذات پر اعتماد تھا۔ اُس نے اٹلی اور سپین کے عقلمندوں اور مدبروں کے خندہ و استہزا کی پروا نہ کی۔ وہ اپنے اصول کی صداقت ظاہر کرنے پر مستعد ہو گیا۔ مہینوں وہ سمندر میں مصائب برداشت کرتا رہا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مگر وہ تکالیف سے نہ گھبرایا اور اپنے روزنامچے میں یہی لکھتا: "آج بھی ہم منزلِ مقصود کی جانب بڑھے"۔ اسے گمان تک نہ تھا کہ وہ گمراہ ہو سکتا ہے۔ اسے سمندر پار ایک سرزمین نظر آ رہی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرتے کرتے امریکہ جا پہنچا لیکن غور تو کیجیے خود اعتمادی کو دوست رکھنے والا انسان اگر بھٹکتا ہے تو بھی اسے انعام کا سزاوار سمجھا جاتا ہے۔ نئی دنیا کی دریافت کا سہرا کولمبس کے سر ہے جو ہند کے بحری راستے کی دریافت سے زیادہ عظیم کام ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قدرت نے انسان کو مفلس پیدا نہیں کیا بلکہ اسے اَن گنت قوتیں دی ہیں جن سے کام لے کر وہ دیوتاؤں جیسے بہادرانہ کام انجام دے سکتا ہے۔ ہماری زندگی کا مقصد بہترین کام انجام دینا ہے، انسانیت کی فلاح و بہبود ہے۔ ہم انسان کہلانے کے جبھی مستحق ہو سکتے ہیں کہ اپنا فرض ادا کریں۔ اگر آپ ماضی میں ایسا نہیں کر سکے تو پروا نہیں، وقت گزر نہیں گیا، آپ کے حصے کا کام جوں کا توں پڑا

ہے۔ قدرت سے آپ کا مضبوط رشتہ ابھی تک قائم ہے۔ اس نے ہمیں پیدا کیا۔ عقل دی بصیرت دی۔ ہم اس کے نور سے فیض یاب ہیں، پس تاریک ماضی کو فراموش کر دیجیے۔ اور ماضی کی فروگذاشتوں کو حال کی مستعدیوں میں بدل دیجیے۔ وہ لوگ جنھیں اپنی ذات پر اعتماد ہوتا ہے، مافات کا دکھڑا نہیں روتے بلکہ اس مردے کو دبا دبایا رہنے دیتے ہیں اور مصروفِ عمل ہو جاتے ہیں۔

ہماری دُنیا نے بتدریج ترقی کی ہے۔ ہمارے آبا و اجداد نے تہذیب کو بامِ عروج تک پہنچانے میں لہو پانی ایک کیا ہے۔ پھر کیا ہمارا فرض نہیں کہ اس کارِ خیر کو جاری رکھیں اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک خوبصورت دُنیا چھوڑ جائیں مگر اس کے لیے ضرورت ہے اس بات کی کہ ہم اپنے آپ پر اعتماد کریں۔ ابنِ آدم نے جب کبھی کوئی کارِ عظیم انجام دیا ہے تو اپنے بل بوتے پر۔ وہ طوفانِ باد و باراں کی پروا کیے بغیر آگے بڑھا جب کہیں جا کر کامیاب ہُوا۔

حکیم فیثا غورث کہتے ہیں: "اپنی عزت آپ کرو" اس کا مفہوم یہی ہے کہ اپنے آپ کو ذلیل اور حقیر نہ سمجھیے۔ اپنے آپ پر بھروسا رکھیے۔ کبھی خیال نہ کیجیے کہ آپ بدقسمت ہیں۔ تقدیر آپ کے خلاف ہے۔ ناکامی آپ کا حصہ ہے

اگر دنیا کے بعض انسانوں کے لیے کامیابی اور بعض کے لیے ناکامی نوشتہ تقدیر ہوتی تو خالقِ کائنات کبھی ہمیں جد و جہد کا حکم نہ دیتے۔ الہامی کتابوں میں کبھی نہ لکھا جاتا کہ جو کوشش کرے گا وہی پائے گا۔ آپ بھولتے کیوں ہیں کہ غلاموں نے کوشش کی تو شہنشاہ بنے۔ ہندوستان پر خاندانِ غلاماں نے نوّے سال تک حکومت کی ہے۔ پھر آپ کیوں فرض کر لیں کہ آپ کبھی ترقی نہیں کر سکتے؟ کبھی آگے نہیں بڑھ سکتے؟

عظمت کسی اور کا حصہ ہے؟ آپ کی جبین دوسروں کو سجدے کرنے کے لیے بنائی گئی ہے؟ اس احساسِ کمتری کو چھوڑ دیجیے۔ اپنے آپ کو معزز انسان سمجھیے۔ وہ انسان جس پر قدرت مہربان ہے اور اُن حالات کو جو بظاہر موافق نہیں سازگار بنانے کے لیے میدانِ دغا میں کود جایئے۔ درسِ حیات شاعرِ مشرق سے سیکھیئے جو فرماتے ہیں:

اگر درسِ حیات از من بگیری ترا ایک نکتۂ سربستہ گویم
وگر جانے بہ تن داری نمیری بمیری گر بہ تن جانے نداری

(اقبال)

۴۔ نصبُ العین

ہر راہی سفر سے پہلے اپنی منزل متعین کرتا ہے۔ آپ ریل گاڑی یا بس میں بیٹھے ہوئے کسی آدمی سے دریافت کیجیے کہ وہ کدھر جارہا ہے تو وہ برجستہ جواب دے گا کہ اس کی منزلِ مقصود کونسی ہے۔ مگر جائے تعجب ہے کہ زندگی کی شاہراہ پر چلنے والے اکثر مسافر یہ نہیں بتا سکتے کہ ان کی منزل کیا ہے اور سفر کی غرض و غایت کیا ہے؟ وہ کشتیٔ عمر پر سوار بیٹھے ہیں لیکن اس سے غرض نہیں کہ کشتی مشرق کو جارہی ہے یا مغرب کو۔ ان کا کوئی نصب العین نہیں۔ ایسے ہی لوگ بحرِ حیات سے موتی حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

آپ نے پستی کے خیالات کو ترک کردیا ہے۔ اپنے آپ کو ترقی کا مستحق سمجھتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہوچکا ہے کہ کامیابی کے مندر میں داخل ہونے کا راستہ ہر شخص کو خود بنانا پڑتا ہے۔ لیکن آپ کی کامیابی اس وقت تک مخدوش رہے گی جب تک آپ کا کوئی نصب العین نہ ہوگا۔ آپ کے خیالات بلند سہی مگر سوال یہ ہے کہ منزل کے تعین کے بغیر آپ کس طرف قدم بڑھائیں گے؟ شتر بے مہار کی طرح کبھی ایک طرف جائیں گے تو کبھی دوسری جانب۔ بڑے شوق سے ایسا کیجیے لیکن خوب یاد رکھیے آپ عروسِ کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکیں گے۔ وہ لوگ جو ایک خاص مرکز کی جانب رواں دواں ہیں منزل تک پہنچ جائیں گے۔

بلکہ آپ بھٹکتے رہ جائیں گے۔

مجھے بہت سے آدمیوں نے بتایا ہے کہ جب کوئی شخص عامل کے پاس عمل حاصل کرنے کے لیے جاتا ہے تو عامل "عمل" دینے سے پہلے واضح الفاظ میں بتا دیتا ہے کہ کامیابی صرف اُسی صورت میں ہوگی جب اس کی ہدایات پر پوری طرح عمل کیا جائے گا۔ اب وہ ہدایت نامہ ملاحظہ فرمائیے :

"چالیس روز تک آدھی رات کے وقت، شہر سے دُور ایک دائرے میں گھنٹوں محبوب کے تصوّر میں غرق رہنا ہوگا۔ اوہام کے شیاطین ڈراؤنی اشکال میں آپ کے پاس آئیں گے۔ کبھی حسن کے وہمی مجسمے اپنے حسن کی نمائش کر کے پھسلانے کی کوشش کریں گے مگر ان کے دامِ فریب سے بچ کر رہنا ہوگا۔ پھر کامیابی آپ کی ہوگی۔ عامل بتاتا ہے کہ اگر اس کی ہدایات پر عمل نہ کیا گیا تو ہلاکت اور بربادی کے شیاطین تباہ کر کے رکھ دیں گے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ جو لوگ چالیس دن تک ان ہدایات پر عمل نہیں کر سکتے۔ ان کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ ایک ایسے تباہ حال کو میں بھی جانتا ہوں۔ وہ دس سال سے ایک مکان میں بند ہے۔ اس نے اس طویل عرصے میں ایک دن کے لیے گھر سے باہر قدم نہیں رکھا۔ اگر کوئی کھانے کے لیے دے دیتا ہے فبہا ورنہ فاقے کرتا ہے۔ اس سے دریافت کیجیے کہ یہ شدید پابندی اور کڑی سزا کس جرم کی پاداش میں ہے؟ تو وہ جواب دیتا ہے: "میں نے اپنے ہادی کے فرمان پر" عمل شروع کیا تھا مگر اسے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ پندرہ دن کے بعد نافرمانی کر بیٹھا ان مجسموں سے ڈر کر جو نیزے لے لے کر مجھ پر حملہ کرتے تھے۔ یہ ڈر مجھے لے ڈوبا اور آج تک

اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔"
میں عملیات کا قائل ہوں نہ رملیات کا لیکن اس مثال سے یہ سبق حاصل کیا جا سکتا ہے کہ کامیابی کے لیے منزل کا تعین کس قدر لابدی ہے۔ جو لوگ مشکلات اور آفات کے شیاطین کے ڈراؤنے مجسمے دیکھ کر اپنے محبوب کے تصوّر سے روگردانی کرتے ہیں اپنی منزل بھول جاتے ہیں انھیں کس قدر شدید سزا کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔
اگر آپ عروجِ کامیابی کے شیدا ہیں تو آپ بھی اپنے لیے ایک عمل منتخب کیجیے۔ اپنی منزل متعین کیجیے۔ اسی کو قبلۂ مقصود سمجھیے۔ اسی کے لیے راتوں کی نیند حرام کر دیجیے۔ اسی کے لیے عیش و تنعم کو بھینٹ چڑھا دیجیے۔ اسی کے نام کی مالا جپیے تو جیت کا سہرا آپ کے سر رہے گا اور اگر آپ نے نصب العین سے روگردانی کی، مشکلات کے بھوت کو دیکھ کر سہم گئے، دائرہ چھوڑ دیا، مرکز سے نگاہ ہٹالی یا عیش و آرام کی پریوں کو دیکھ کر اس سے منہ موڑ لیا تو پھر آپ کا حشر بھی اس آدمی کا سا ہوگا جو دس سال سے اپنی زندگی قید تنہائی میں بسر کر رہا ہے۔ فرق ہوگا تو صرف اس قدر کہ وہ مکان میں بند ہے تو آپ افلاس، پست حالی اور کم مائیگی کی چار دیواری میں محصور ہوں گے۔ ان روشنیوں سے محروم رہیں گے جو اُن لوگوں کی قسمت میں ہیں جو مقصد حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔
"یہ بہت بڑا کام ہے بہت ہی بڑا کام اور یہی خیال ہمیں آگے بڑھانے کے لیے کافی ہے"۔ یہ الفاظ پنڈت جواہر لال نے آج سے بیس برس پیشتر ایک امریکی صحافی سے کہے تھے۔ پنڈت نہرو خوب جانتے تھے کہ برطانیہ طاقتور ہے، اس کے پاس توپیں ہیں، اسلحہ ہے، بارود ہے، وہ چاہے تو ہندوستان کے ایک ایک

لیڈر کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے، انھیں جلاوطن کر سکتا ہے۔ اس وقت سلطنت برطانیہ اتنی وسیع تھی کہ اس پر سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ ایک ایسی سلطنت کے خلاف بغاوت کرنا اور اسے کہنا کہ ہندوستان چھوڑ دے، فی الواقع بڑا کام تھا۔ اس قوم سے جو مشرق و مغرب کی مالک تھی، اپنا وطن چھینا بہت ہی بڑا کام تھا۔ پھر کیا ہندوستان کی آزادی چاہنے والوں نے ہتھیار ڈال دیے؟ اس ڈر سے کہ برطانیہ سے ٹکر لینا موت اور ہلاکت کو دعوت دینا ہے؟

نہیں۔ پنڈت نہرو کہتے ہیں "یہ خیال کہ ہمیں بہت ہی بڑا کام انجام دینا ہے ہمیں آگے بڑھانے کے لیے کافی ہے۔ ہم اس لیے اپنا نصب العین نہیں چھوڑ سکتے کہ اس تک رسائی آسان نہیں۔" اگر آپ کا نصب العین بلند ہے۔ آپ جو کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کا حصول مشکل دکھائی دیتا ہے تو ہراساں نہ ہو جیے۔ بزدل نہ بنیے اور نہرو کی طرح کہیے "یہی خیال ہمیں آگے بڑھانے کے لیے کافی ہے" تو اس سے کامیابی کے امکانات روشن ہوں گے۔

ایلا وھیلر ولکاکس کامیاب شاعرہ تھی۔ اس کا کلام ان لوگوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیتا ہے جو اپنی زندگی بنانا چاہتے ہیں اور انسانیت کی خدمت کو اپنا نصب العین بناتے ہیں۔ ایلا اُن فنکاروں میں شمار ہوتی ہے جو اخلاقی قدروں کو زندہ و بحال رکھنے کے حق میں ہیں۔ وہ ایک شعر میں اس بات پر فخر کرتی ہے کہ اس نے زندگی بھر کوئی ایسی بات نہیں لکھی، کوئی ایسا شعر نہیں کہا جسے اپنے نامۂ اعمال میں دیکھ کر ندامت محسوس کرے۔

مگر ایلا کو کامیابی جد و جہد کے بغیر حاصل نہیں ہوئی۔ وہ لکھتی ہے کہ اس نے

زندگی بخش نظمیں لکھنے والی شاعرہ بننے کا عزم صمیم کرلیا۔ نصب العین کے تعین کے بعد مشقِ سخن شروع کی۔ ابتدا میں اسے کئی ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کا کہنا ہے کہ "میں نے اپنی ایک طویل نظم طباعت کے لیے یکے بعد دیگرے بہت سے ناشرین کے پاس بھیجی۔ مگر کوئی اسے چھاپنے پر تیار نہ ہوتا تھا۔ وہ اسے معیاری نظم نہ سمجھتے تھے اور ناقابل اشاعت سمجھ کر واپس بھیج دیتے تھے۔ جب وہ نظم میرے پاس واپس پہنچتی تو میں بددل نہ ہوتی بلکہ اس کی اصلاح کرتی۔ بالآخر بیسویں ناشر نے اسے چھاپنے پر آمادگی ظاہر کردی"۔ اس کے بعد ایلا کی نظمیں امریکہ میں وقعت کی نگاہ سے دیکھی جانے لگیں اور اکثر زبانوں میں ان کا ترجمہ ہوا۔ ہم بھی ایلا کی طرح کامیاب ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اس کی طرح مایوسی کے حملوں سے بچنے کی ہمت رکھتے ہوں۔ ایلا کی طرح نصب العین حاصل کرنے کا تہیہ کرلیں اور پہلی ناکامی پہ حوصلہ نہ ہار بیٹھیں بلکہ اپنے عیوب کی اصلاح کریں اور اپنی تخلیق کو بے عیب بنا ڈالیں۔

کارساز مطلق نے ہر انسان کا رجحانِ طبع مختلف بنایا ہے۔ ایک آدمی سائنس سے شغف رکھتا ہے تو دوسرا صنعت و حرفت سے۔ ایک ادب میں نام پیدا کر سکتا ہے تو دوسرا طب میں۔ بعض لوگ ایجادات و اختراعات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ تحقیق و تفحص سے مانوس ہیں تو بعض سیر و سیاحت سے۔ اس لیے نصب العین کے تعین سے پہلے آپ یہ دیکھیے کہ قدرت نے آپ کا مزاج کس سانچے میں ڈھالا ہے؟ علم کی کس شاخ سے آپ کو دلی مناسبت ہے جس میں آپ مہارت حاصل کرکے محیر العقول کارنامے

انجام دے سکتے ہیں؟ اور یہ معلوم کرنا دشوار نہیں۔ ضرورت ہے تو اس بات کی کہ آپ خوب چھان بین کیجیے۔ اپنے ذہنی رجحان کا پتا لگائیے۔ حالات کا جائزہ لیجیے۔ اگر اس تحقیقات میں کچھ وقت صرف ہو، مختلف علوم و فنون کی کتب کا مطالعہ کرنا پڑے، ماہرین سے مبادلۂ خیالات کرنا پڑے تو اس سے نہ گھبرائیے۔ زندگی کھیل تو ہے نہیں کہ جب چاہا کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لیا اور جب جی میں آئی اسے چھوڑ کر کسی اور شعبے سے وابستہ ہو گئے۔ جب اس تحقیق کے بعد آپ یہ نتیجہ اخذ کریں کہ آپ کا ذہنی لگاؤ صنعت و حرفت سے ہے تو پھر ادبی کتب اور دواوین کے مطالعے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ان کتب کا مطالعہ کیجیے جو صنعت و حرفت کے متعلق معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ اگر آپ کی مالی حالت اچھی نہیں، آپ صنعتی ادارہ قائم نہیں کر سکتے تو دل نہ چھوڑ بیٹھیے۔ کسی صنعتی ادارے سے منسلک ہو جائیے۔ اگر آپ نے دل لگا کر کام کیا تو تھوڑے عرصے میں معقول مشاہرہ حاصل کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ اور جب آپ کے حالات ساز گار ہو جائیں یعنی یا تو آپ اتنا کچھ پس انداز کر لیں کہ اپنا کاروبار شروع کر سکیں یا پھر آپ کی قابلیت کا اس قدر شہرہ ہو جائے کہ کوئی سرمایہ دار آپ کے ساتھ مل کر کام کرنے اور سرمایہ لگانے پر تیار ہو جائے تو قسمت آزمائیے۔ بہر حال یہ زریں اصول نہ بھولیے کہ کامیابی کے لیے نصب العین کا تعین ضروری ہے۔

چند دن ہوئے مجھے بیمہ کمپنی کے ایک ایجنٹ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔

اس نے بتایا کہ دس سال پیشتر وہ ریاست حیدر آباد دکن میں سب اوورسیر تھا۔ جب دو سال کی ملازمت کے بعد اسے مستقل نہ کیا گیا تو وہ بددل ہو گیا اور ملازمت چھوڑ کر ٹھیکیدار بن گیا۔ اس کے پاس سرمایہ نہ تھا مگر اعزہ و اقارب سے مانگ تانگ کر اور دیہاتی بنک سے قرضہ لے کر چار پانچ ہزار روپے جمع کیے اور لگا ٹھیکیداری کرنے۔ کام تو وہ جانتا تھا مگر ٹھاٹھ تھے امیرانہ۔ ہزار کماتا تھا تو دو ہزار خرچ کرتا تھا۔ یہ سلسلہ دیر تک نہ چل سکا۔ جب قلاش ہو گیا تو ٹھیکیداری چھوڑ ایک کمپنی کی ملازمت اختیار کر لی۔ چھ مہینے بعد حیدر آباد کو الوداع کہی اور پنجاب میں اس کمپنی کی شاخیں کھولنے کی ذمہ داری سنبھالی۔ تین مہینے بعد اس کمپنی کو بھی چھوڑ دیا اور ایک اور کمپنی سے وابستہ ہو گیا۔ اب وہ انشورنس کمپنی کا ملازم ہے۔ میں نے اس کی داستانِ زندگی سن کر دریافت کیا، کیا اس نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ اس کی ناکامی کی وجہ کیا ہے؟ وہ اس کا کچھ جواب نہ دے سکا لیکن قارئین جان سکتے ہیں کہ وہ ناکام ہوا تو اس لیے کہ وہ مستقل مزاج نہ تھا۔ کوئی نصب العین نہ رکھتا تھا۔ دس سال میں سب اوورسیر انجینئر اور ٹھیکے کا کام کرنے والے لاکھ پتی بن جاتے ہیں مگر یہ سب اوورسیر بیمہ کمپنی کا ملازم بن کر رہ گیا اور دس سال کے بعد اسی قدر مشاہرہ حاصل کر رہا ہے جتنا اسے سب اوورسیر کی حیثیت سے ملتا تھا۔ وہ مستقل نہ ہونے پر ٹھیکیدار بنا تو اس میں ناکام ہونے پر کچھ اور۔ اسے اگر آج کوئی کمپنی، کوئی ادارہ موجودہ مشاہرے سے دس روپے ماہوار زیادہ مشاہرہ دے تو وہ موجودہ کام کو بھی چھوڑ سکتا ہے۔ وہ ہر جگہ ہر شعبے میں ناکام رہا ہے۔

کیونکہ اس کا نصب العین کامیاب انسان بننا نہیں۔ وہ بلندی کا خواب تو دیکھتا ہے مگر ان اصولوں پر عمل نہیں کرتا جن کی پابندی کرکے رفعت نصیب ہوتی ہے دُنیا میں ان لوگوں کا کامیاب ہونا مشکل ہے جن کے خیالات و اعمال میں تعاون نہیں۔ وہ سوچتے ہیں کچھ اور، کرتے ہیں کچھ اور۔ ان کے خیالات کا رُخ مشرق کی جانب ہے مگر اعمال مغرب کو قبلۂ مقصود بنائے ہوئے ہیں۔ کیا آپ ایک لمحے کے لیے بھی تصوّر کرسکتے ہیں کہ اکاؤنٹ برانچ میں کام کرنے والا وہ کلرک جو حساب کتاب میں دلچسپی لینے کے بجائے علمِ عروض کی کتاب پڑھتا رہتا ہے۔ کبھی کامیاب اکاؤنٹنٹ بن سکے گا؟ میں یہ نہیں کہتا کہ انسان جس پیشے کو اپنے لیے منتخب کرے اس میں فنا ہو کر رہ جائے اور فنونِ لطیفہ سے حظ نہ اٹھائے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو کام کے وقت کام اور آرام کے وقت آرام کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں۔ میں کام کے بعد تفریح کا قائل ہوں اور ان لوگوں کو جو کامیاب زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں ہمیشہ مشورہ دیا کرتا ہوں کہ وہ دفتر کو گھر نہ لایا کریں یعنی اپنا کچھ وقت سیر و تفریح میں ضرور صرف کیا کریں۔ لیکن کام کے وقت تفریح اور لہو و لعب کے نظریے کو مہلک سمجھتا ہوں جو آدمی دفتر میں بریکار بیٹھتا ہے یا اپنے کام کے بجائے کسی اور شغل میں مصروف رہتا ہے اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنا کام ختم کرلے گا خوش فہمی ہے۔ اگر سائنس کا طالب علم سائنس کے گھنٹے میں بزمِ ادب کی سرگرمیوں میں حصّہ لیتا ہے تو وہ سائنس دان بن چکا۔ سائنس دان بننے کے لیے تو پتّا مارنا پڑتا ہے۔ سائنس کے پروفیسر کے تمام کے تمام لیکچر سُننے پڑتے ہیں اور انھیں دماغ میں جگہ دینا پڑتی ہے۔

شہر میں کوئی سائنٹیفک سوسائٹی ہو اور وہ مشہور سائنس دانوں کی تقاریر کا انتظام کرتی ہو تو اس میں شرکت لازم سمجھی جاتی ہے، سائنس کی کتب اور جرائد کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ غرض وقت کا بیشتر حصّہ سائنس دانوں کی صحبت میں بسر کیا جاتا ہے۔

جو کلرک دیوانۂ شعر ہے وہ شاعر تو بن سکتا ہے مگر اکاؤنٹنٹ بننا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے اپنے خیالات اور اعمال میں ہم آہنگی پیدا کیجیے، اپنی منزل کا تعیّن غور و خوض کے بعد کیجیے، اپنا نصب العین بنائیے، پھر اس کے حصول کے لیے مصروفِ کار ہو جائیے۔ اپنے آپ کو کامیاب بنائیے، اپنے پسندیدہ کام میں دوسروں سے بازی لے جانے کی کوشش کیجیے، یہی زندگی ہے کامیاب زندگی۔

فاتحانہ انداز

۱۔ اہمیّت

ڈاکٹر مارڈن کہتے ہیں "ہر انسان بادشاہ ہے، قدرت نے کسی کو حقیر اور مفلس پیدا نہیں کیا، خدا نے سب کو دل و دماغ سے نوازا ہے جو بذاتہٖ بڑی دولت ہیں اور دُنیا کی تمام اچھی چیزوں کو حاصل کرنے کی اہمیّت رکھتے ہیں"۔ ڈاکٹر مارڈن سچ کہتے ہیں۔ انسان جو چاہے بن سکتا ہے، جو چاہے کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی مخفی قوتوں کو بروئے کار لائے اور نشیب سے فراز کی طرف بڑھتے وقت جو مشکلات پیش آئیں انھیں پرکاہ سمجھے۔ اگر راہ طے کرتے وقت ہمت جواب دینے لگے، یہ خیال پیدا ہو کہ میں اعلیٰ منصب کا اہل نہیں کیونکہ میرے والدین غریب ہیں تو ڈاکٹر مارڈن کا ہمنوا ہو کر کہے:

"میں گدائے بے نوا نہیں، میرا نام بھکاری نہیں، ناکامی میری قسمت نہیں، میں شہزادہ ہوں، کامیابی میرا پیدائشی حق ہے اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس سے محروم نہیں رکھ سکتی۔"

یہ آواز قلب کی گہرائیوں سے نکلے تاکہ مؤثر ثابت ہو۔

ڈاکٹر مارڈن گمنام اور موقع پرست انسان نہیں جو اپنی کتابیں فروخت کرنے کے لیے ہمارے قلوب میں امید کی شمعیں جلاتے ہیں، جھوٹے وعدے کرتے

ہیں۔ ہمارے جذبات کو مشتعل کر کے ہم سے خراجِ تحسین حاصل کرنا چاہتے ہیں جو جی میں آتا ہے کہہ گزرتے ہیں۔ اُن کا شمار تو بیسویں صدی کے مشہور رجائیین میں ہے وہ زندگی کا رُخ روشن دکھاتے ہیں اور ایک حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو کہ قدرت نے انسان کو مفلس، بے نوا، بھکاری اور نااہل پیدا نہیں کیا بلکہ اسے وہ سب کچھ دیا ہے جو دینے کے قابل تھا۔ اس حقیقت کی توثیق الہامی کتابیں بھی کرتی ہیں۔

انسان مشتِ خاک سہی، ظالم و جاہل سہی مگر اس کی خودی تو دیکھیے کہ اس بار کو برداشت کرنے کے لیے آگے بڑھا جسے اُٹھانے سے پہاڑوں نے انکار کر دیا اور فرشتوں نے عذر پیش کیا۔ اس کی خودی ہی میں اس کی فتح کا راز مضمر ہے وہ فاتح ہے، امام دوراں ہے، اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا، اسے کوئی محروم نہیں رکھ سکتا۔ وہ ہرتا ہے تو اپنی غلطی سے، گرتا ہے تو اپنی غفلت سے، کمزور ہے تو اس لیے نہیں کہ اسے کمزور پیدا کیا گیا بلکہ اس لیے کہ اس نے زور آزمائی نہ کی۔ مفلس ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کے پیدا کرنے والے نے اسے دولت کا اہل نہ سمجھا بلکہ اس لیے کہ اس نے یا تو اپنے مخفی خزانوں کو بے نقاب نہیں کیا یا پھر انھیں لُٹا ڈالا۔ فرش پر بیٹھا ہے تو اس لیے نہیں کہ جاہ و جلال کا مستحق نہیں بلکہ اس لیے کہ اس کی خودی سوئی پڑی ہے اور وہ اسے کام میں نہیں لاتا۔ وہ زمین پر خدا کا نائب ہے، خلیفہ ہے اور سب کچھ اس کے لیے ہے۔

اس برہنہ حقیقت کو ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال نے بھی واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اقبال سے سب سے بڑی ناانصافی اُن شارحین نے کی جنھوں نے اسے

ملّا اور صوفی بنا ڈالا، اسے ایک خاص گروہ کا ترجمان کہا اور اس کے کلام کے اس حصّے کی توضیح کی ضرورت محسوس نہ کی جس میں وہ انسان سے براہِ راست خطاب کرتا ہے اور اسے کہتا ہے:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

وہ جانتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہم بھی جان لیں:

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے — دیکھیں گے تجھے دُور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیّل کے کنارے — پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے

تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

اقبال کہتا ہے اپنے آپ کو اس لیے حقیر نہ سمجھیے کہ آپ خاک نشیں ہیں۔ غنچے سے رمزِ حیات سیکھیے جو خاکِ تیرہ سے اُگتا ہے مگر اس کی نگاہ آفتاب پر ہوتی ہے۔ اقبال سے درسِ حیات لیجیے گا تو وہ لبِ ساحل بیٹھنے کی اجازت نہ دے گا بلکہ کہے گا:

اے کہ آسودہ نشینی لبِ ساحل برخیز
کہ ترا کام بگرداب و نہنگ است ہنوز

وہ نہیں چاہتا کہ ہم معمولی کامیابیوں پر مطمئن ہو جائیں۔ ان خزانوں سے جو شمار میں نہیں آ سکتے، تھوڑا سا حصّہ لے کر سمجھ لیں کہ زیادہ کی طلب روا نہیں۔ اسے تو اس بات کا افسوس ہے کہ ہم نے اپنا پورا حصّہ وصول کرنے کی جدوجہد کیوں نہ کی:

تُو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

اقبال کی تمنا ہے کہ ہمارے عزائم بلند اور جدوجہد لامتناہی ہو، ہم مردانہ وار مشکلات کا مقابلہ کریں، ان سے ہراساں نہ ہوں، کانٹوں سے اُلجھ کر زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالیں، آسانیوں کے پرستار نہ بنیں، راہ بے خطر ہو تو اس پر سفر ہی نہ کریں، تگ و تاز کو زندگی سمجھیں اور ہمارا نصب العین بلند ہو:

زشرر ستارہ جویم زستارہ آفتابے
سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

اقبال زندگی کا راز داں ہے، پیامبر حیات ہے، وہ ہمیں بتاتا ہے کہ خدائی بخشش کی کوئی انتہا نہیں، جس قدر کوشش کروگے اسی قدر پاؤ گے اور اس کا ثبوت وہ لوگ بہم پہنچاتے ہیں جن کے والدین مفلس تھے، جن کا بچپن ایسے ماحول میں گزرا جس میں دم گھٹتا ہے جو ابتدائی تعلیم بھی حاصل نہ کر سکے۔ جب یہ لوگ عرصۂ حیات میں داخل ہوئے تو ان کی کوئی سفارش نہ تھی۔ کوئی انھیں آگے بڑھنے میں مدد دینے والا نہ تھا۔ وہ مزدور، قلی، سپاہی اور کلرک بھرتی ہوئے لیکن ذاتی سعی سے بلند مرتبے حاصل کیے۔ ان میں سے کچھ قوموں اور ملکوں کی قسمت کے مالک بنے تو بعض زر و جواہر حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ کچھ علم و ادب کے آسمان پر ستارے بن کر چمکے، ایسے ستارے جن کی چمک دمک سے ہمارا جہان آج تک منور ہے تو بعض نے ایجاد و اختراع کی دنیا میں ناموری حاصل کی۔

اگر ایک آدھ انسان ناداری و افلاس کے چنگل سے رہا ہو کر امیر بن جاتا، فرش سے اُٹھ کر عرش تک جا پہنچتا تو ہم سمجھتے کہ قسمت نے اس کا ساتھ دیا ہے، نصیبا اس کا یاور ہے یا یہ محض اتفاق ہے لیکن بیسیوں افراد کا بامِ عروج تک

پہنچنا اتفاق کی جادوگری ہے نہ قسمت کی کرشمہ سازی۔ اور اگر بفرضِ محال یہ تسلیم
بھی کر لیا جائے کہ قسمت یا تقدیر انسانی زندگی پر بہر حال اثر انداز ہوتی ہے پھر بھی
آپ کے لیے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ آپ کو کیونکر معلوم ہوا کہ آپ قسمت کے ہیٹے ہیں
یا تقدیر نے آپ کے خلاف فیصلہ دے رکھا ہے؟ آپ نے قسمت کا کیا بگاڑا ہے
کہ وہ بلا وجہ آپ کی مخالفت کرے؟ اگر وہ نپولین پر مہربان ہو سکتی تھی، ڈسرائیلی پر
نوازش کر سکتی تھی، شیر شاہ سوری کا ساتھ دے سکتی تھی، لنکن کی بگڑی بنا سکتی
تھی، سٹالن کی بن سکتی ہے، ٹرومین کی حمایت کر سکتی ہے، امریکہ اور یورپ کے
بیسیوں کروڑ پتیوں کو غریبی اور مفلسی کے شکنجے سے نکال سکتی ہے، خود ہمارے
وطن کے متعدد افراد کو زندگی بنانے میں مدد دے سکتی ہے تو اسے آپ سے
کیوں پرخاش ہو؟ وہ آپ کی مخالفت کیوں کرے؟ آپ کا نصیبا کیوں
بگاڑے؟ آپ کو منہ نہ لگانے کی قسم کیوں کھائے؟ اگر تقدیر اس قافلے کے
خلاف نہ تھی یا مخالفت پر ادھار کھائے بیٹھی تھی مگر ان لوگوں نے اس سے
لڑ کر اسے شکست دے کر کامیابی حاصل کی تو آپ کیوں شکست قبول کر لیں؟
ہتھیار ڈال دیں؟ کیوں نہ اقبال کی مان کر اس پر ٹوٹ پڑیں:

حدیثِ بے خبران است با زمانہ بساز
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

اگر تقدیر مخالفت پر کمر بستہ ہو چکی ہے، اگر قسمت نے آپ کی کمرِ ہمت توڑ دینے
کا منصوبہ بنا لیا ہے، اگر فلکِ ناہنجار و کج رفتار نے آپ کو گرانے کا تہیہ کر لیا
ہے، اگر زمانہ آپ کو مایوس دیکھنا چاہتا ہے تو آپ اس کے خلاف کیوں

اعلانِ جہاد نہ کریں؟ اس سے پنجہ آزمائی کیوں نہ کریں؟ اور اسے پچھاڑ کر اپنا راستہ کیوں نہ بنائیں:

گفتند زنانِ ما آیا بتو مے سازد؟
گفتم کہ نمے سازد گفتند کہ برہم زن (اقبال)

ایک اور رجائی شاعر کہتا ہے "آگے بڑھو۔ ہمیشہ آگے بڑھو۔ اپنے آپ کو سربلند کرنے کے لیے آگے بڑھو۔ خداوند کی متبرک مرضی پوری کرنے کے لیے آگے بڑھو۔

"دُنیا کی، دُنیا کے دماغ کی اور دُنیا کی رُوح کی ترقی کے لیے برابر بڑھتے جاؤ، کہیں نہ رُکو، تکان کا خیال دماغ پر حاوی نہ ہونے دو، نیند کی موت کو پاس نہ پھٹکنے دو۔ یہ دونوں تباہی کی بیٹیاں تمہارا راستہ روکنے کے لیے شیطان نے مقرر کی ہیں۔ ان کے خوبصورت الفاظ پہ نہ جاؤ، ان کی حسین آنکھیں نہ دیکھو، ان کے محبوب اشارے تمھیں مضبوط ارادے سے متزلزل کر دیں گے۔

کہیں نہ رُکو، کہیں مت ٹھہرو، منزلِ مقصود ابھی دُور ہے اور دن ختم ہو رہا ہے۔ آگے چلو، آگے چلو — آگے چلو"[1]

مارڈن کہتا ہے "تم بادشاہ ہو۔ کامیابی تمہارا پیدائشی حق ہے" اقبال کا ارشاد ہے:

ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تُو ہے

اور ہمارا رجائی شاعر کہتا ہے "آگے بڑھنا اپنی اور بنی نوع انسان کی ترقی

---

[1] منقول از "ہمایوں"

کے لیے جدوجہد کرنا خداوند کی متبرک مرضی کو پورا کرنا ہے" تو پھر آپ کیوں اپنے
آپ کو ذلیل سمجھیں؟ اپنی قابلیت سے کام نہ لیں؟ ماحول ناسازگار ہو، ملازمت
مرضی کی نہ ہو تو مایوسی کو شعار بنالیں۔ حالات کی اصلاح کی طرف مائل نہ ہوں مگر
شکووں کا دفتر دراز کرنے میں پیش پیش رہیں۔ گریڈ حاصل کرنے میں ناکام رہیں تو
زیست سے بیزار ہو جائیں۔ کسی کو موٹر میں بیٹھا دیکھیں تو ٹھنڈی سانس بھر کر رہ
جائیں۔ کسی کو خوش پوش پائیں تو حسرت و افسوس کا مجسمہ بن جائیں۔ یوں تو حالات
نہ سدھریں گے۔ اگر آپ فی الواقع اچھی ملازمت کے خواہش مند ہیں، ترقی کی تمنا رکھتے
ہیں۔ اچھا مکان، لباس اور موٹر حاصل کرنا چاہتے ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت آپ
کو ان سے محروم نہیں رکھ سکتی بشرطیکہ آپ پست خیالی کو اپنی زندگی تباہ کرنے
کی اجازت نہ دیں۔ اپنے آپ کو شہزادہ سمجھیں۔ بلند خیال بنیں۔ کامیابی کو اپنا پیدائشی
حق تصوّر کریں اور میدانِ وغا میں کود پڑیں۔ "تکان کے خیال کو دماغ پر حاوی
نہ ہونے دیں۔ نیند کی موت کو پاس نہ پھٹکنے دیں۔ بزدلی کے عفریت سے ہرگز
نہ ڈریں۔ عزم و استقلال سے کام لیں۔ اولوالعزمانِ دانشمند کی طرح سمندر پھاڑ کر
اور کوہ سے دریا بہائیں۔ ٹھوکریں کھانے سے گر پڑیں تو زمین کو بستر استراحت
سمجھ کر خوابِ شیریں کے مزے نہ لیں بلکہ اٹھ کھڑے ہوں اور کپڑے جھاڑ کر
پھر چل پڑیں۔ آگے کی طرف بڑھیں۔ دوستوں نے گرتے دیکھ لیا ہے تو کیا
ہوا؟ کیا وہ زندگی کے سفر میں کبھی نہیں پھسلے؟ ان سے کبھی لغزش نہیں ہوئی؟
پھر یہ ندامت کیوں؟ کیا آپ نہیں جانتے، گرنا گناہ نہیں، البتہ گر کر نہ اٹھنا
گناہِ عظیم ضرور ہے؟

ایک قدیم ضرب المثل ہے "ڈوبتے وہی ہیں جو تیرنا جانتے ہیں"۔ بالکل بجا، بالکل درست۔ مگر یہ بھی تو کیسے تیراک وہی بنتے ہیں جو ڈوبنے سے نہیں ڈرتے۔ موتی انھیں کے ہاتھ لگتے ہیں جو غوطہ لگانے کا خطرہ مول لیتے ہیں۔ جنت کے جزیرے میں پہنچ کر اپنا نصیبا وہی جگاتے ہیں جو مشکلات کو خاطر میں نہیں لاتے۔ پاتے وہی ہیں جو جاگتے ہیں۔ سونا انھیں کو ملتا ہے جو پہروں اس کی تلاش میں مصروف رہتے ہیں۔ پھر یہ بزدلی کیوں؟ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا حصّہ آپ کو ضرور دیا جائے، آپ کا حق کوئی غصب نہ کر سکے تو حق لینا سیکھیے، یہ نہ سمجھیے کہ آپ کا حصّہ کسی اور کی قسمت بن سکتا ہے، پھر اس کے حصول کے لیے ڈٹ جائیے۔

بعض افراد ہمیشہ تصویر کا تاریک رُخ دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں اُنھیں کوئی چیز اچھی دکھائی نہیں دیتی۔ آپ اُن کے سامنے کسی کامیاب انسان کی جدوجہد کی داستان بیان کیجیے، وہ فوراً پکار اٹھیں گے "اجی رہنے دیجیے، آپ کس کی تعریف کر رہے ہیں، اسٹالن کی؟ غریب ماں باپ کا بیٹا تھا۔ قوت بازو سے اس بلندی تک پہنچا؟ چہ خوب قبلہ۔ آپ نے اس کے سوانح حیات کا مطالعہ کیا ہے؟ یونہی سنی سنائی باتوں پر ایمان لے آئے؟ اور کہہ دیا کہ اس نے اپنی ہمّت سے ترقی کی۔ اجی یہ سب پروپیگنڈا ہے۔ خالص اشتمالی پروپیگنڈا۔ کیا کہنے ہیں آپ کی قابلیت کے کہ ایسی باتیں بے سوچے سمجھے کر گزرتے ہیں۔" آپ نپولین کی خود اعتمادی کا ذکر کیجیے تو کہیں گے "خود اعتمادی؟ یہ کس جانور کا نام ہے؟ پھر خاص انداز میں،

سُنی ضرور ہے دیکھی کہیں نہیں میں نے

پڑھنا ہیں گے۔ آپ علامہ اقبال کو پاکستان کا تصور بخشنے والا کہیں گے تو اس کی پر زور مخالفت کریں گے " تصور پاکستان کا خالق اقبال ؟ مولانا عقل کے ناخن لیجیے، پہلے علامہ جمال الدین افغانی کے افکار کا مطالعہ کیجیے، پھر کہیے پاکستان کا تصور علامہ افغانی نے دیا یا اقبال نے " اور اگر آپ کسی موقع پہ علامہ افغانی کو اسلامستان کا علمبردار کہیں گے تو پھر ان پہ نکتہ چینی کی جائے گی۔ غرض کوئی اُن کے معیار پہ پورا نہیں اترتا کیونکہ عیب جوئی ان کی گھٹی میں داخل ہو چکی ہے۔ یہ عادت اُنھیں کسی کام کا نہیں رہنے دیتی۔ اُنھیں بے عمل اور کاہل بنا دیتی ہے۔

وہ ہمت کر کے اُن لوگوں کے ساتھ جا ملنے کی کبھی کوشش نہ کریں گے جو انھیں پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ چکے ہیں۔ ان کا کام ہے دوسروں میں عیب ڈھونڈنا اور یوں اپنے نفس کو فریب دینا۔ آپ انھیں کہیے دنیا دارالمکافات ہے یہاں جو محنت کرتے ہیں انعام حاصل کرتے ہیں جو بوتے ہیں وہی کاٹتے ہیں تو فوراً کہہ دیں گے

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

پھر ارشاد فرمائیں گے " اگر آپ کو ان حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا جن سے ہم دوچار ہیں۔ اگر آپ کو ترقی سے محض اس لیے محروم کر دیا جاتا کہ آپ کسی خان بہادر کے فرزند نہیں تو پھر یوں ہوائی قلعے نہ بناتے۔" وہ اپنی موجودہ حالت پہ شاکی ضرور ہیں لیکن اسے بہتر بنانے کی زحمت کبھی گوارا نہیں کرتے۔ وہ بلندی پہ پہنچ کر اس طائفے کے ساتھ بیٹھنے کی جدوجہد نہیں کرتے جو ذاتی سعی سے وہاں پہنچ چکا ہے بلکہ چاہیں گے کہ بلندی پہ پہنچنے والے رجعت قہقری کر کے ان کے ساتھ آملیں۔ اگر آپ ترقی کے متمنی ہیں تو اس گروہ میں ہرگز شامل نہ ہو جیے، ان کے ہمنوا نہ

بنیے، ان کی تقلید نہ کیجیے، گلے شکووں کے دفتر تہ کر کے رکھ دیجیے، کامیاب لوگوں کی عیب جوئی کر کے دل کی بھڑاس نکالنے کی عادت چھوڑ دیجیے بلکہ ان کی طرح کامیاب بننے کی کوشش کیجیے، ان کی طرح اپنے آپ کو کامیاب دیکھیے، زندگی کے میدان میں فاتحانہ انداز سے داخل ہو جائیے اور اپنا راستہ خود بنانے کی کوشش کیجیے۔

فاتحانہ انداز اختیار کرنے سے آدھی جنگ جدوجہد شروع کرنے سے پہلے ہی جیت لی جاتی ہے۔ "میں شہزادہ ہوں کامیابی میرا پیدائشی حق ہے۔" یہ الفاظ جسم میں تازہ روح پھونکتے ہیں، حوصلہ بڑھاتے ہیں، اس قابل بناتے ہیں کہ ہم بلا وجہ خوف زدہ نہ ہوں۔ اگر آپ ملازمت کے خواہاں ہیں، کاروبار میں کامیابی چاہتے ہیں تو ہر حالت میں اپنے آپ کو کامیابی کا مستحق سمجھیے۔ اگر کسی دفتر میں ملازمت چاہتے ہیں تو دفتر میں داخل ہونے سے پہلے اپنے آپ کو سنبھالیے۔ ایک لمحے کے لیے بھی تصور نہ کیجیے کہ آپ کو ملازم نہ رکھا جائے گا۔ جب مینجر نے آپ کو انٹرویو کے لیے بلایا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ آپ کی علمی قابلیت سے جو آپ نے اپنی درخواست میں درج کی تھی، مطمئن ہے پھر گھبراہٹ کیوں؟ آپ بھیک مانگنے تو چلے نہیں۔ کارپوریشن کو ایک ایسے فرد کی خدمات مطلوب ہیں جو اس کے "شعبۂ فروخت" کی تنظیم اعلیٰ پیمانے پر کر سکے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ اس کام کو بہ طریقِ احسن انجام دے سکتے ہیں کیونکہ آپ نے اس کی باقاعدہ تعلیم اور ایک اچھے ادارے میں تربیت حاصل کی ہے تو پھر آپ کی خدمات کیوں قبول نہ کی جائیں گی؟ اگر آپ دفتر میں داخل ہونے سے ہچکچاتے ہیں یا شکست خوردہ انداز

میں داخل ہوں گے، ڈرتے سہمتے مینجر کی میز کے قریب پہنچیں گے اور جاتے ہی دکھڑا رونا شروع کردیں گے "جناب عالی! آپ نے مجھے انٹرویو کے لیے بلایا ہے۔ کام کے متعلق جو کچھ آپ دریافت فرمائیں گے اس کا جواب تو دوں گا ہی لیکن پہلے میری درد بھری کہانی سن لیجیے۔ میں بے روزگار ہوں۔ خاندان کے پانچ افراد کا بار میرے دوش پر ہے۔ میرے حال زار پر رحم کیجیے۔ میں آپ کے جان و مال کو دعا دوں گا۔" یہ اپیل دردناک سہی لیکن مشکل یہ ہے کہ کاروباری اداروں کے مینجر اس قسم کی اپیلیں سننے کے عادی ہوتے ہیں اس لیے یہ اُنھیں کم ہی متاثر کیا کرتی ہیں۔ علاوہ بریں مینجر شعبۂ فروخت کی اصلاح اور تنظیم چاہتا ہے مگر آپ ہیں کہ اس کے فائدے کی کوئی بات نہیں کہتے، اپنی کہے جاتے ہیں۔ جانتے ہیں آپ کہ اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا؟ مینجر یہ سمجھے گا کہ آپ اس کے مطلب کے آدمی نہیں۔ آپ کو شعبۂ فروخت کی تنظیم سے کوئی دلچسپی نہیں اس لیے وہ آپ کو ٹالنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے بجائے اگر آپ کا انداز فاتحانہ ہوا، آپ گدا گر نہ بنے اس کے سوالات کے معقول جوابات دیئے اور اس پر ظاہر کیا کہ آپ کو ملازم رکھنا آپ پر احسان نہیں بلکہ ادارے کے لیے مفید ہے تو مینجر آپ کی خدمات قبول کرنے پر تیار ہو جائے گا۔

میں نے ان لوگوں سے جو با روزگار ہیں یا کامیاب کاروباری ہیں، فاتحانہ انداز اختیار کرنے کے متعلق مبادلۂ خیالات کیا ہے۔ ان میں سے اکثر کہتے ہیں کہ زندگی کے سفر میں، مقابلے کے امتحان میں اور حصول ملازمت کے لیے فاتحانہ انداز ہمیشہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے اسے آزمایا اور تیر بہدف

Courtesy Prof Shahid Amin. Digitized by eGangotri

پایا۔ میرے ایک دوست لکھتے ہیں "میں نے ایک بار ایک انعامی مضمون لکھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں انعام حاصل کروں گا کیونکہ میرا دل گواہی دیتا تھا کہ اس موضوع کے متعلق جو کچھ میں جانتا ہوں اور کوئی نہیں جان سکتا۔ چنانچہ مضمون بھیجنے سے پہلے میں نے اپنے چند احباب سے کہہ دیا کہ اس انعامی مقابلے میں اوّلیت کا سہرا میرے سر رہے گا اور فی الحقیقت پہلا انعام مجھے دیا گیا۔ میں نے بارہا اس نسخے کی آزمائش کی ہے اور ہر بار اسے صحیح پایا ہے۔" آپ بھی اسے آزما کر دیکھیے، آپ بھی کامیابی سے ہمکنار ہوں گے مگر شرط یہ ہے کہ آپ کو اپنی کامیابی کا سو فی صد یقین ہو۔ "یہ کام صرف میں انجام دے سکتا ہوں۔ میرے سوا کوئی اور فرد اسے بہ طریقِ احسن پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا۔" اگر ان الفاظ پر جو آپ زبان سے ادا کرتے ہیں، یقین رکھتے ہیں، سو فی صد یقین تو پھر مقابلے کی دوڑ میں کوئی آپ کو پچھاڑ نہیں سکتا۔

میں خود زندگی کی دوڑ میں پٹا بھی ہوں۔ مجھے بعض اوقات شکست کا منہ بھی دیکھنا پڑا لیکن اس وقت جب مجھے اپنے آپ پر بھروسا نہ رہا۔ جب میں نے اپنے آپ کو شہر یار اور تاجدار نہ سمجھا۔ جب مجھے شکوک و شبہات نے گھیر لیا کہ کوئی اور مجھ سے بڑھ سکتا ہے۔ جب میں نے کسی اور کی تقلید کرنا چاہی۔ کسی اور کا مشورہ محض اس لیے قبول کر لیا کہ وہ مجھ سے زیادہ تجربہ کار اور عقلمند ہے۔ سچ یہ ہے کہ میں نے جب کبھی دوسروں کی تجویز کو اپنی تجویز سے بہتر سمجھے بغیر اسے قبول کیا منہ کی کھائی۔ جب فاتحانہ انداز کو چھوڑا، جب بھکاری بن گیا، بُری طرح پٹا اور مجھے ہمیشہ مایوسی ہوئی۔

کاروبار میں بھی کامیابی کا انحصار بہت حد تک فاتحانہ انداز پر ہے۔ میں اپنے مشاہدے کی بنا پر کہتا ہوں کہ جو کاروباری مارکیٹ میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوئے انھوں نے بہت جلد اپنی جگہ بنا لی اور ان دکان داروں سے جو اس مارکیٹ میں پہلے سے کاروبار کر رہے تھے، گاہک چھین لیے۔ جو انسان فتح کے نشے میں مست نہ ہو، جسے اپنی کامیابی کا یقین نہ ہو وہ کپڑے کی دکان کھولنے کی جرأت نہ کرے گا۔ "جب پہلے ہی یہاں کپڑے کی بہت سی دکانیں موجود ہیں تو میں کیونکر کامیاب ہو سکوں گا۔ سب گاہک انھوں نے سنبھال رکھے ہوں گے۔ میری دکان پر کون آئے گا؟" یہ خیال اسے پست حوصلہ بنا دے گا اور وہ کہیں اور دکان سجانے کا منصوبہ بنائے گا لیکن عالی ہمت کاروباری اس دقت کو خاطر میں نہ لائے گا۔ وہ جانتا ہے کہ پرانے دکان داروں سے گاہک کیونکہ چھینے جاتے ہیں اس لیے وہ کسی سے مرعوب نہ ہوگا۔

ہندوستان کی تقسیم سے پہلے شمالی پنجاب کے ایک چھوٹے سے قصبے میں دو بیوپاریوں نے کپڑے کا تھوک بیوپار شروع کیا۔ وہ جانتے تھے کہ پنجاب میں کپڑے کے متعدد تھوک بیوپاری موجود ہیں۔ ان کا مقابلہ کرنا بچوں کا کھیل نہیں لیکن انھوں نے اپنی جگہ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ چھ مہینے نہ گزرنے پائے تھے کہ کپڑے کے بیوپاری ان کی دکان پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ وہ بڑے بڑے شہروں کے بیوپاریوں کی طرح ولایت سے براہ راست کپڑا منگوایا کرتے تھے۔ ان کی دکان میونسپل کمیٹی کے علاقے میں نہ تھی اس لیے انھیں چونگی کے محصول کی بچت ہوتی تھی جس کی وجہ سے وہ بڑے شہروں کی نسبت کم دام پر مال فروخت کیا کرتے تھے۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ ان کی بکری امرت سر کے بڑے بڑے تاجروں سے کم نہ تھی۔ ایک کپڑے کی تجارت پر کیا موقوف، عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ خواہ کسی قسم کا کاروبار کیوں نہ ہو، بعض نئے کاروباری جلد ان لوگوں سے بازی لے جاتے ہیں جو مدت سے اس بازار میں کاروبار کرتے ہیں۔ ان کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ ان اصولوں کی پیروی کرتے ہیں جو کامیابی کے مندر میں داخل ہونے پر مدد دیتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک فاتحانہ انداز ہے۔

سیاست میں فاتحانہ انداز کے بغیر نام پیدا کرنا تو جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اگر آپ لیڈر بننا چاہتے ہیں تو پہلے فن خطابت سیکھیے۔ لاکھوں کے مجمع میں بے دھڑک بولنا اتنا سہل نہیں جتنا بظاہر نظر آتا ہے۔ میں نے اوسط درجے کے تعلیم یافتہ افراد کو تقریر کرتے بھی دیکھا ہے اور تعلیم یافتہ مقررین کو پسینے پر پسینا آتے بھی۔ میں نے ایک مشہور مقرر سے اس کی کامیابی کا راز دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ جب وہ سٹیج پر کھڑا ہوتا ہے تو اس بات کو بھول جاتا ہے کہ تقریر سننے والوں میں سے کوئی اس سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے اور اس کے دلائل سن کر مسکرائے گا۔ میں اپنے آپ کو سب سے بہتر، سب سے اعلیٰ سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہوتا ہے کہ میرے الفاظ حاضرین کے دل میں اثر کر رہیں گے۔ یہ اس مقرر کے اپنے الفاظ ہیں۔ اس کے بعد اس نے ایک مثال کے ذریعے سے اپنے نظریے کی وضاحت کی۔ وہ کہنے لگا "آپ نے کبھی جادو کا تماشا دیکھا ہے۔ جادوگر حاضرین سے زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہوتا لیکن اس کا دل و دماغ اس شراب سے مست ہوتا ہے کہ وہ سب سے بہتر ہے، سب سے زیادہ جانتا ہے،

سب کے خیالات پر حکومت کر سکتا ہے، سب سے اپنی بات منوا سکتا ہے۔ یہ یقین اس کا، یہ فاتحانہ انداز اسے کامیاب بناتا ہے۔ وہ سارے مجمع کو مبہوت بنا دیتا ہے، مسحور کر لیتا ہے، کوئی اسے جھٹلانے کی جرأت نہیں کرتا۔ یہی گر خطابت میں کامیابی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، یہ دلیل بڑی حد تک معقول ہے۔ خطیب کا کام مجمع کو مسحور کرنا اور اپنے ڈھب پر لانا ہے۔ وہ بھی اسی صورت میں کامیاب ہوگا جب اپنے آپ کو فاتح سمجھے گا۔ اگر آپ اچھا خطیب بننا چاہتے ہیں تو اسی نظریے پر عمل کیجیے۔ اگر آپ اپنے دوستوں کے سامنے اپنے خیالات موزوں الفاظ میں پیش کر سکتے ہیں، اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں دلائل پیش کر سکتے اور انھیں منوا سکتے ہیں تو آپ میں اچھا مقرر بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ ضرورت اس صلاحیت کو کام میں لانے کی ہے۔

پنجاب اسمبلی کے ایک اجلاس میں ایک رکن تقریر کرنا چاہتے تھے مگر تھے بزدل۔ وہ ڈرتے تھے کہ تقریر نہ کر سکیں گے اس لیے تقریر لکھ کر ساتھ لائے۔ اور جب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو اسمبلی کے صدر نے ٹوک دیا۔ جانتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ انھوں نے لکھی ہوئی تقریر پڑھنا شروع کر دی۔ اس پر ایوان میں قہقہے بلند ہوئے۔ وہ بیچارے رٹ پٹا گئے۔ وہ بولنا چاہتے ہیں مگر زبان ساتھ نہیں دیتی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ وہ بمشکل تمام دو چار جملے کہہ کر بیٹھ گئے۔ اس رکن کی تذلیل کا ذمہ دار کون ہے؟ آنریبل سپیکر؟ نہیں۔ اسمبلی کے ارکان؟ ہرگز نہیں۔ اسمبلی مدرسہ تو ہے نہیں جہاں بچوں کو تقریر کی مشق کرائی جائے۔ اس ایوان میں داخل ہونے کی چاہت ہے تو پہلے بولنا سیکھیے۔ بہت اچھی

طرح تقریر کرنا کیونکہ :

یہاں پگڑی اچھلتی ہے اسے میخانہ کہتے ہیں

میں ایک لیڈر کو جانتا ہوں جن کی تحریر بڑی پسند کی جاتی ہے لوگ ان کے مقالات پڑھتے ہیں تو سر دھنتے ہیں جب ان کا توسنِ قلم حریفوں کے خلاف چلتا ہے تو انھیں روندتا لتاڑتا بڑھا چلا جاتا ہے۔ انھوں نے قلم کے زور سے لاکھوں آدمیوں کو اپنے پیچھے لگا لیا۔ ان میں سے سیکڑوں ایسے تھے جو ان کے اشارے پر سر کٹانے کو آمادہ تھے۔ انھوں نے ایک تحریک کی بنیاد رکھی تو لاکھوں مسلمان اس تحریک میں شامل ہو گئے اور لاکھوں ایسے تھے جو اس تحریک کے باقاعدہ رکن تو نہ تھے مگر معاون ضرور تھے۔ جب تحریک پھلنے پھولنے لگی تو لیڈر کو عوام کے سامنے آنا پڑا لیکن وہ خطابت کے مردِ میدان نہ تھے۔ چاہا کہ تقریر پڑھ کر عوام کو متاثر کر سکیں اور تقریر پڑھنے کے لیے یہ دلیل بھی پیش کی کہ وہ اپنی زبان سے کوئی ایسا لفظ ادا نہیں کرنا چاہتے جس کی ذمہ داری قبول نہ کر سکیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ انسان جوشِ خطابت میں بسا اوقات افراط و تفریط سے کام لیتا ہے۔ یہ دلیل معقول سہی۔ لیکن اس بات کا کیا علاج کہ عوام نے اسے معقول نہ سمجھا کیونکہ وہ عادی ہیں فاتحانہ انداز سے متاثر ہونے کے۔

جہاں تک تحریر کا تعلق ہے۔ لیڈر اس میں فتح و نصرت کا علم اڑاتے بڑھے چلے جاتے تھے۔ وہ کسی سے نہ ڈرتے تھے۔ کسی کو اپنے سے بہتر نہ سمجھتے تھے۔ وہ بر ملا لکھتے تھے کہ دین اور سیاست میں ان کی سی بصیرت کسی کے بس کا روگ نہیں۔ چونکہ ان کی تحریر میں خود اعتمادی کی جھلک تھی، ان کا انداز فاتحانہ تھا اس لیے

لوگ اس سے متاثر ہوئے اور یوں متاثر ہوئے کہ دونوں ہی ان کے مداح بن گئے۔ مگر جب وہی لیڈر تقاریر کے ذریعے سے انھیں فتح کرنے نکلے اور عوام نے انھیں تقریر پڑھتے دیکھا تو بیحد مایوس ہوئے۔ ان کی یہی کمزوری انھیں لے ڈوبی۔

نپولین کی کامیابی کا راز اس کے فاتحانہ انداز میں مضمر تھا۔ ابھی وہ فوج میں جونیئر افسر تھا کہ فرانس میں انقلاب برپا ہو گیا۔ عوام کے جذبات اتنے مشتعل ہو چکے تھے کہ انھیں قابو میں رکھنا غیر ممکن سمجھا جاتا تھا۔ انقلابیوں کے گروہ در گروہ شہر میں پھر رہے تھے۔ ارکان حکومت ان سے خائف تھے اور نہ جانتے تھے کہ انھیں کیونکر منتشر کیا جائے کہ اتنے میں ایک آدمی ایوانِ حکومت میں داخل ہوا اور کہنے لگا " میں ایک ایسے نوجوان افسر کو جانتا ہوں جو انقلابیوں کو منتشر کر سکتا ہے"۔ " اسے فوراً بلاؤ" ارکانِ حکومت نے بالاتفاق کہا۔ اس وقت نپولین کو بلایا گیا اور اس نے فی الواقع انقلابیوں کو منتشر کر دیا۔

اٹلی کے سابق مختار مطلق مسولینی نے بھی اپنی زندگی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فاتحانہ انداز کی اہمیت واضح کی ہے۔ مسولینی ابھی اٹلی کا مختارِ مطلق نہ بنا تھا کہ ایک دن اس کی مخالف پارٹی نے اس مکان کا محاصرہ کر لیا جس میں مسولینی کا دفتر تھا۔ مشتعل ہجوم مطالبہ کر رہا تھا کہ مسولینی کو ہمارے حوالے کیا جائے ورنہ ہم مکان نذرِ آتش کر دیں گے۔ جب مسولینی کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ اپنے آپ کو عوام کے حوالے کر دے تو وہ مکان سے باہر نکل آیا۔ بیباکانہ عوام میں گھس گیا اور ایک جانب چل پڑا۔ عوام اس کے فاتحانہ انداز کی تاب نہ لا سکے اور انھوں نے اسے راستہ دے دیا۔ کوئی اس کا بال تک بیکا نہ کر سکا۔

یہ خیال نہ کیجیے کہ نپولین اور مسولینی فاتحانہ انداز اختیار کرنے کے مستحق تھے مگر آپ کو اس کا استحقاق نہیں کیونکہ آپ مفلس ہیں، آپ کسی رئیس کے بیٹے نہیں، آپ کو کوئی جانتا تک نہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ نپولین، مسولینی اور دنیا کے دوسرے اکثر مشہور آدمی غریب والدین کے بیٹے تھے؟ ان کا بچپن عسرت میں گزرا۔ اگر وہ جیت سکتے ہیں، فاتحانہ انداز اختیار کر سکتے ہیں، اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر بنا سکتے ہیں، دوسروں سے بہتر بن سکتے ہیں اور ان پر حکومت کر سکتے ہیں تو آپ اپنے آپ کو حقیر کیوں سمجھیں اور کامیابی و فتح کا سزاوار نہ سمجھیں؟

۲۔ شخصیت اور فاتحانہ انداز

فاتحانہ انداز اس وقت تک اختیار نہیں کیا جا سکتا جب تک آپ کی شخصیت ان خوبیوں کا مرقع نہ ہو گی جو دوسروں سے آپ کو ممتاز بنائیں۔ موجودہ مشینی دور جدوجہد کا دور ہے۔ آج کل سرکاری ادارے ہوں یا غیر سرکاری، بیسیوں امیدواروں میں سے اپنے مطلب کے آدمی منتخب کرتے ہیں۔ پہلے سب امیدواروں کا تحریری امتحان لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد بات چیت کے ذریعے سے ان کے گن دیکھے جاتے ہیں۔ انتخابی بورڈ امیدواروں سے بات چیت کر کے دیکھتا ہے کہ کس امیدوار کی خدمات قبول کی جائیں۔ سچ پوچھیے تو انٹرویو میں امیدوار کی شخصیت کا جائزہ لیا جاتا ہے جو امیدوار اس امتحان میں کامیاب ہوتا ہے، یعنی وہ بورڈ پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ اس کی خدمات سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ اسے منتخب کر لیا جاتا ہے۔

مجھے ایک فوجی افسر نے جو عرصے تک انتخابی بورڈ کا صدر رہ چکا ہے بتایا "تحریری امتحان کی غرض و غایت صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ امیدوار کی معلومات کس قدر ہیں اور وہ افسروں کے تربیتی مرکز کا نصاب سمجھنے کی استعداد رکھتا ہے یا نہیں۔ زیادہ اہمیت انٹرویو کو دی جاتی ہے کیونکہ امیدوار کی شکل و صورت چال ڈھال اور گفتگو سے اس چھپے ہوئے انسان کو باہر نکالنے کی کوشش کی

جاتی ہے جو جسم کی چار دیواری میں مفید ہے۔ ہم ان نوجوانوں کی تلاش میں ہوتے ہیں جو اچھے لیڈر بن سکیں، جن میں قیادت کا مادہ بدرجہ اتم موجود ہو۔ گویا انٹرویو میں امیدوار کی شخصیت کا جائزہ لیا جاتا ہے اور یہ طریق انتخاب صرف فوجی افسروں کے انتخاب کے لیے اختیار نہیں کیا جاتا بلکہ بڑے بڑے کاروباری اداروں کا معمول بھی تقریباً اسی قسم کا ہے۔ وہ بھی علمی قابلیت اور فنی صلاحیت سے زیادہ شخصیت سے متاثر ہوتے ہیں اور جن میں کاروبار چلانے کی صلاحیتیں فنی تربیت رکھنے والوں سے زیادہ ہوتی ہیں انھیں گراں قدر مشاہرے دیتے ہیں۔ کارنیگی انسٹی ٹیوٹ نے ایک رپورٹ مرتب کی ہے جس میں واضح کیا ہے کہ کامیابی کے لیے فنی قابلیت پندرہ فی صد مفید ہوتی ہے مگر شخصیت یعنی دوسروں سے تعلقات قائم کرنا، ان سے کام لینا اور انصرامی قابلیت پچاس فی صد۔ بات اصل میں یہ ہے کہ موجودہ دور میں تعلیم کی آسانیاں مہیا ہیں۔ ہر انسان مدارس فنیہ اور پرائیویٹ مدارس میں شامل ہو کر کسی کاروبار اور صنعت کے متعلق معلومات اور ڈپلوما حاصل کر سکتا ہے۔ کئی صنعتوں کی تعلیم خط و کتابت کے ذریعے سے بھی دی جاتی ہے۔ اس لیے کام جاننے والوں کی کثرت ہے۔ اگر ان میں سے کام کے آدمی چن لینا دشوار ہے تو امیدواروں کے لیے ملازمت حاصل کرنا بھی کم دشوار نہیں۔ جب ایک اسامی کے سو دو سو امیدوار ہوں، سب اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوں، سبھی تقریباً فنی تربیت سے بھی مزین ہوں تو ان میں سے کسی ایک کے ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہونے کا انحصار ظاہر ہے کہ تعلیمی اور فنی قابلیت پر نہ ہوگا بلکہ شخصیت پر ہوگا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان لوگوں کو منتخب کر لیا جاتا ہے جن کے تحریری پرچے ناکام رہنے والے امیدوارو

سے اچھے نہیں ہوتے۔

اگر آپ کارگاہِ حیات میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو تعلیمی اور فنی قابلیت کے علاوہ اپنی شخصیت بھی بنائیے۔ اپنی ذات میں کچھ ایسی خوبیاں پیدا کیجیے جنھیں کبھی نظر انداز نہ کیا جا سکے۔ صرف آپ ہی "میں کر سکتا ہوں" کے نشے میں مست نہ ہوں بلکہ جب ادارے کے مینجنگ ڈائرکٹر سے ملیں تو گفتگو کے بعد وہ بھی دل میں کہے "یہ کر سکتا ہے، اس کی خدمات ادارے کے لیے ناگزیر ہیں"۔ جو لوگ شکایت کرتے ہیں کہ جس ادارے میں انھوں نے برسوں کام کیا ہے اور اس کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اُس نے اُن کی قدر نہ کی۔ وہ اکثر اوقات اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اگر وہ اپنی خدمات کا ناگزیر ہونا ثابت کر سکتے تو مینجنگ ڈائرکٹر انھیں ملازمت سے جواب دینے کی حماقت کا ارتکاب کبھی نہ کرتا۔ بھلا وہ کون ڈائرکٹر ہوگا جو دانستہ اپنا نقصان کر سکتا ہے۔ . . وہ کسی کاروبار میں اپنا سرمایہ کس غرض سے لگاتا ہے؟ منافع حاصل کرنے کی خاطر۔ پھر اگر اسے یقین ہو جائے کہ آپ کا وجود اس کے ادارے کے لیے مفید ہے، آپ اس کے کاروبار کو فروغ دے سکتے ہیں تو وہ آپ سے نجات کیوں حاصل کرے گا؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شخصیت بنائی نہیں جا سکتی، یہ خدا کی دین ہے اور انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے۔ قدرت کسی انسان کو باوقار پیدا کرتی ہے تو کسی کو وقار سے محروم رکھتی ہے۔ ان کی نظر میں شخصیت اکتسابی شے نہیں جو ذاتی سعی سے بنائی جا سکے۔ یہ نظریہ صحیح نہیں۔ اس کی تبلیغ اس دور میں کی گئی جب یقین کیا جاتا تھا کہ انسان اپنی قسمت کا خود معمار نہیں۔ اس کی تقدیر کا نوشتہ اس کی

پیدائش سے سالہا سال پہلے لکھ دیا گیا ہے۔ اسے ہاتھ پاؤں اور دل و دماغ دیے گئے ہیں لیکن وہ بے بس ہے۔ وہ اپنی بدنصیبی کو خوش بختی میں نہیں بدل سکتا۔ وہ مفلس ہے تو اسے اس پر شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ افلاس اس کی قسمت میں لکھا ہے، اس لیے اس کا فرض ہے کہ وہ صبر و شکر سے کام لے۔ وہ مظلوم ہے تو تسلیم و رضا کو خو بنائے۔ اس دار فانی میں جو لوگ تکالیف اٹھائیں گے انھیں کی عاقبت سنورے گی۔ اس لیے قوائے جسمانی و دماغی سے کام لینے کی ضرورت نہیں مگر بیسویں صدی کا انسان اس مہلک نظریے کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ انسان ہر آن ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے۔ قدرت نے اس کا وجود اس قسم کے خلیوں سے بنایا ہے جو ہر وقت بدلتے رہتے ہیں۔ پہلے خلیے مر جاتے ہیں تو نئے جنم لیتے ہیں۔ یوں جسم کے علاوہ دل و دماغ میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس تبدیلی کا اثر ہر وقت ہماری شخصیت پر پڑتا رہتا ہے یعنی وہ بدلتی رہتی ہے۔ اس لیے اپنی حالت بہتر بنانے کی کوشش نہ کرنا کہ بچپن افلاس میں گزرا ہے روا نہیں۔ جب کائنات کے پیدا کرنے والے خالق کا فرمان ہے کہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک تبدیل نہیں کی جاتی جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے اور جو قانون اقوام و ملل کے عروج و زوال سے تعلق رکھتا ہے وہی کم و بیش انفرادی ترقی و تنزل کے لیے بھی ہے تو پھر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا نہ صرف یہ کہ دانشمندی سے بعید ہے بلکہ خدائی قانون کی مخالفت بھی ہے۔ شخصیت بدلی جا سکتی ہے۔ انسان اگر چاہے تو اس میں انقلاب لا سکتا ہے۔ مفید انقلاب جس سے وہ ترقی کا سزاوار بن سکے۔ یہ کام ہے تو دشوار اور صبر آزما

لیکن کامیابی مطلوب ہے تو یہ انقلاب لائے بغیر چارہ نہیں ۔

شخصیت کی اصطلاحی تعریف کچھ ہی کیوں نہ ہو، اس کا مفہوم انفرادیت ہے۔ ایک ادارے میں کئی سو افراد کام کرتے ہیں۔ تقریباً ایک ہی قسم کے فرائض بجا لاتے ہیں مگر ان میں سے ایک فرد ایسا ہوتا ہے جو "جتنے پیسے اتنا کام" کے اصول کا پابند نہیں بلکہ اسے اپنے کام سے عشق ہوتا ہے، وہ اپنے کام پر حاوی اور اس کی جزئیات تک سے آگاہ ہوتا ہے۔ جب کوئی الجھن پیدا ہوتی ہے تو اس کی امداد طلب کی جاتی ہے۔ جب کوئی ادق مسئلہ پیش آتا ہے تو سب اسی کے پاس دوڑے آتے ہیں۔ وہی تجاویز پیش کرتا، اصول دریافت کرتا اور نئے ڈیزائن تیار کرتا ہے۔ اس کی خدمات اس ادارے کے لیے باقی کارکنوں کی متحدہ مساعی سے زیادہ قیمتی ہوتی ہیں جبھی تو اسے سب سے زیادہ مشاہرہ ملتا ہے۔ اس کی انفرادیت اسے ادارے کی ممتاز شخصیت بناتی ہے۔ آپ کسی کارخانے کے انچارج ہیں، انجینئر ہیں یا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ اگر نام پیدا کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ کی تمنا یہ ہے کہ آپ کی خدمات کو قیمتی سمجھا جائے، آپ ترقی کی انتہائی بلندیوں تک پہنچنا چاہتے ہیں تو شخصیت بنائیے، منفرد شخصیت، آپ کو ادب سے لگاؤ ہے تو ادیب بنیے۔ صنعت و حرفت سے دلچسپی ہے تو انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کیجیے۔ غرض علم و فن کی جس شاخ سے رغبت ہے اس کی تعلیم حاصل کیجیے۔ مگر صرف تعلیم کافی نہیں، اس سے دلی لگاؤ پیدا کیجیے اور کمال حاصل کیجیے۔ یہ خیال نہ کیجیے کہ دنیا کو ادیبوں کی ضرورت ہے تو انجینئروں کی نہیں یا وہ سائنس دانوں کی محتاج ہے تو طبیبوں کی نہیں۔ دنیا کی ترقی کا سہرا سب کے سر یکساں ہے۔ اور راستے ترقی کی موجودہ منزل تک طبیبوں، انجینئروں

مصوّروں، موسیقاروں اور ادیبوں کی مشترکہ مساعی نے پہنچایا۔ اس لیے آپ ادیب بھی بن سکتے ہیں، صنعت کار بھی۔ لیکن یاد رکھیے لوگ اس وقت تک آپ کی قابلیت کا اعتراف نہ کریں گے، آپ کے فن کے قائل نہ ہوں گے جب تک آپ کی تخلیق میں آپ کی شخصیّت منعکس نہ ہوگی، آپ کے فن میں انفرادیت کی جھلک نہ ہوگی، آپ عام ڈگر سے ہٹ کر یہ ثابت نہ کردیں گے کہ آپ وہ کچھ کرسکتے ہیں جو دوسرے نہیں کرسکتے ہو اوروں کے بس کی بات نہیں۔

اقبالؔ "شخصیت" تھے تو اس لیے کہ انھوں نے کسی کی اندھا دھند تقلید نہ کی اگر وہ مقلّد ہوتے تو شاید ہی خلعتِ بقائے دوام کے مستحق سمجھے جاتے۔ ان کی عظمت کا راز مضمر ہے ان کی جرأت رندانہ یعنی فاتحانہ انداز میں۔ اقبالؔ نے اشعار کہے مگر نئے انداز میں۔ انھوں نے اپنی شاہراہ خود منتخب کی اور تھوڑے ہی عرصے میں اپنا لوہا منوا لیا۔ اقبالؔ جبھی تو کہتے ہیں:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

مسلمان ان کی سیاسی بصیرت کے قائل بھی صرف اس وقت ہوئے جب انھوں نے مسلمانوں کے تحفظ کے مسئلے پر غور کرتے وقت عام ڈگر کو خیرباد کہی۔ جب تک وہ سرشفیع، سرفضل حسین اور اسی قماش کے دیگر لیڈروں کی طرح جداگانہ انتخاب منوانے کے لیے زور دیتے رہے اس وقت تک انھیں امتیازی حیثیت حاصل نہ تھی، مگر جونہی اقبالؔ نے مسلمانوں کے لیے علٰحدہ آزاد ریاست کو ہندو مسلم مسئلے کا واحد حل بتایا وہ اپنے ہمعصر سیاست دانوں سے بازی لے گئے۔

۳۔ شخصیّت کی تعمیر

آپ "شخصیت" بننا چاہتے ہیں تو آزاد رہنا اور آزاد سوچنا سیکھیے۔ بزرگوں کے خیالات کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا، ان کے مشوروں کو قبول کرنا اور مشاہیر کی تقلید تو آپ سہی۔ لیکن اپنے گرد ایسا حصار نہ بنائیے کہ اس سے باہر نہ نکل سکیں یا اس سے باہر نکلنا گناہ سمجھیں۔ اگر آپ نے تقلیدِ محض کو شعار بنایا تو آپ کی شخصیّت دبی رہے گی آپ کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکیں گے۔ اس دولت سے جو خدا نے آپ کو دے رکھی ہے فائدہ نہ اٹھا سکیں گے اور آپ کے جوہر رائگاں جائیں گے۔ اقبال نے پاکستان کا تصوّر دے کر مسلمان لیڈروں کے اندازِ فکر کو ترک کر کے ثابت کر دیا ہے کہ:

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اگر قوتِ متخیلہ کو کبھی کبھی آزاد چھوڑ دیا جائے، اسے کھلی فضاؤں میں، ان دیکھی سرزمینوں میں جہاں مشاہیر کے قدم نہیں پہنچے جس کی سیاحت بزرگوں نے نہیں کی، پرواز کرنے کی اجازت دی جائے تو حیرت انگیز کارنامے انجام دیے جا سکتے ہیں۔ پچپن فی صد کی بھیک مانگنے والے بھکاریوں کو آزاد سرزمین دلائی جا سکتی ہے۔ پچپن فی صد کے بجائے تقریباً سو فی صد نشستیں دلائی جا سکتی ہیں۔ وہ ایجادیں اور اختراعیں جن سے فرزندانِ آدم متمتع ہو رہے ہیں قوتِ متخیلہ ہی کے کرشمے ہیں۔ اگر تقلید ہی کرنا ہے تو

بڑے لوگوں کے اس "عمل" کی تقلید کیجیے یعنی قوتِ متخیلہ سے کام لیجیے تاکہ کوئی نئی چیز، نئی راہ دریافت کر سکیں۔

قوتِ متخیلہ کو آزاد چھوڑنے کا مطلب یہ نہیں کہ آوارہ خیالی کو عادت بنایا جائے۔ آپ انجینئر ہیں، دفتر میں بیٹھے ہیں، ضروری کاغذات میز پر پڑے ہیں مگر آپ ہیں کہ سگرٹ منہ میں لیے بیٹھے ہیں، تخیلات کی دنیا میں گم، دنیا و مافیہا سے بے خبر تخیل کی پرواز کبھی آپ کو لندن پہنچا رہی ہے تو کبھی نیویارک۔ تصوری تصور میں کسی سے آنکھ لڑائی جا رہی ہے۔ اشارے کنایے ہو رہے ہیں۔ ادھر سے فراغت ہوئی تو بیگم کی فرمائش کا خیال آتا ہے۔ اگر آپ کو قوتِ متخیلہ یونہی کام میں لانی ہے تو اس سے باز ہی رہیے تو اچھا ہے ورنہ نئی بات کرتے کرتے ملازمت سے ہاتھ نہ دھونا پڑے۔

ہاں اگر آپ سوچ رہے ہیں کہ لاہور کو سیلاب سے بچانے کا کیا مستقل انتظام کیا جائے، یا راولپنڈی ڈویژن کے بارانی اضلاع کو سیراب کرنے کی سکیم پر غور کر رہے ہیں یعنی آپ دفتر کے کام سے فارغ ہو چکے ہیں، ضروری کاغذات پر دستخط کر چکے ہیں۔ یا اتفاق سے کام زیادہ نہیں اور آپ اس گتھی کو سلجھا رہے ہیں، تصور میں ایک نئی سکیم بناتے ہیں، پھر اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں، اس کے نقائص رفع کرتے ہیں تو اس قسم کی خیال آرائی مفید ثابت ہوگی۔ آپ کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ اپنا مستقبل بنا رہے ہیں۔ آپ کامیاب سکیم بنا کر ہی رہیں گے۔

انسان فطرتاً جدت پسند ہے۔ کارخانہ دار انسانی فطرت کو خوب سمجھتے ہیں۔

وہ جانتے ہیں کہ انسان اعجوبہ پسند ہے، جدّت چاہتا ہے، اس لیے وہ جلد جلد اپنی مصنوعات کے ڈیزائن بدلتے رہتے ہیں۔ کپڑے کے ڈیزائن جلد جلد بدلے جاتے ہیں تو محض اس لیے کہ انسانی طبیعت ایک ہی ڈیزائن کو بار بار دیکھ کر اُکتا جاتی ہے۔ دُنیا کے مشہور سگرٹ تیار کرنے والی کمپنی ڈبلیو ڈی اینڈ ایچ او ولز تھوڑے تھوڑے عرصے بعد نئی قسم کا سگرٹ مارکیٹ میں بھیج دیتی ہے تاکہ لوگ ایک ہی قسم کے پیکٹ دیکھ کر اکتا نہ جائیں۔ وہ اپنا مقابلہ خود کرتی رہتی ہے تاکہ کوئی اور مقابلے کی جراٗت نہ کر سکے۔ ولز کے ایک قیمت کے نئے اور پرانے سگرٹوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں میں ایک ہی قسم کا تمباکو استعمال کیا جاتا ہے، البتہ پیکٹ کا رنگ بدل دیا جاتا ہے۔ یوں وہ اپنے گاہکوں کو اپنے قابو میں رکھتی ہے۔ ولز کمپنی کا وہ ملازم جو عوام کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے، ان کے مزاج کو سمجھنا اور ان کی پسند کی چیز مارکیٹ میں بھیجتا ہے، سب کارکنوں سے زیادہ اہم شخصیت ہے اور کمپنی اسے معقول معاوضہ دیتی ہے۔

راک فیلر کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اُس نے ایک بار ایک ایسے فرد کی خدمات حاصل کیں جو دفتر میں بیٹھا ہر وقت بندرگاہ کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ دوسرے افسروں نے اس افسر کے طرزِ عمل پر چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔ وہ شاکی تھے کہ نووارد کام دام تو کرتا نہیں، بس سمندر کی لہریں گنتا رہتا ہے مگر مشاہرہ ان سے زیادہ لیتا ہے۔ یہ شکایت راک فیلر تک پہنچی تو اس نے شکایت کرنے والے افسروں کو بتایا کہ ان کی کارپوریشن نے جس تجویز کے ذریعے سے حال ہی میں دس لاکھ ڈالر کمائے وہ اسی بیکار افسر کا دماغی کارنامہ ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس افسر کی طرح آپ کی خدمات کو اہم سمجھا جائے، آپ کا بیٹھنا کسی کو ناگوار نہ گزرے اور یہ بیکاری کارآمد ثابت ہو تو غور و فکر کو عادت

بنا ہے، سوچ بچار کرنا سیکھیے، جس ادارے میں ملازم ہیں اس کی ترقی اور کامیابی کے لیے نئی نئی تجاویز پیش کیجیے اور ڈائرکٹر کو یقین دلا دیجیے کہ آپ کا وجود اس کے کاروبار کی ترقی کی ضمانت ہے۔

کامیاب انسان میں ایک اور وصف یہ ہوتا ہے کہ وہ بات کی تہ تک فوراً پہنچ جاتا ہے اور جب ایک بار فیصلہ کر لیتا ہے تو اس میں شاذ ہی ردّ و بدل کا روادار ہوتا ہے، وہ ساتھیوں اور دوستوں سے مشورہ ضرور کرتا ہے۔ ان مشوروں پر غور بھی کرتا ہے۔ لیکن ردّ و بدل صرف اسی صورت میں کرتا ہے جب اسے یقین ہو جائے کہ جو تجویز اس کے دوست نے پیش کی ہے وہ اس کی تجویز سے بہتر ہے۔ وہ فیصلہ کرنے سے پہلے دوسروں کی تجاویز پر غور کر سکتا ہے مگر فیصلہ کرنے کے بعد تبدیلی پر آمادہ نہیں ہوتا۔ امریکہ کے صدر ابراہیم لنکن اور روزویلٹ کی عادت تھی کہ وہ ہر معاملے کے متعلق دوسروں سے مبادلۂ خیالات کرتے تھے، لوگوں کی تجاویز سنتے تھے، ان کی نکتہ چینی بھی برداشت کرتے تھے۔ مگر جب فیصلہ کر لیتے تھے تو پھر اس میں تبدیلی مشکل ہی سے کرتے تھے۔ اکبر اعظم کے دربار میں ملک کے ممتاز علماء اور سیاست دان موجود تھے۔ وہ اہم معاملات میں ان سے مشورہ ضرور کیا کرتا تھا۔ مگر مانتا اس کی تھا جس کی تجویز اس کی اپنی تجویز سے مطابقت رکھتی تھی۔ یا اس سے بہتر ہوتی تھی۔ آپ کے سامنے کوئی اہم مسئلہ ہے تو اس پر غور کیجیے، خوب غور کیجیے۔ جن لوگوں کو مشورہ دینے کا اہل سمجھتے ہیں، جن کے متعلق آپ کو یقین ہے کہ وہ صائب الرائے ہیں۔ ان سے مبادلۂ خیالات کیجیے، پھر فیصلہ کیجیے، لیکن سوچ بچار کرنے اور دوسروں سے مبادلۂ خیالات کرنے کے بعد جو فیصلہ کیا

ہے۔ اس میں صرف اس لیے ردوبدل پر تیار نہ ہو جائیے کہ آخری لمحے پر کسی نے کہہ دیا ہے وہ اسے پسند نہیں کرتا۔ اگر آپ نے اتنی سی بات پر اپنے فیصلوں کو معرضِ التوا میں ڈالنا شروع کر دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی قوتِ ارادی کمزور ہو جائے گی۔ آپ ہر وقت دوسروں کے مشوروں کو وقیع سمجھنے کے عادی بن جائیں گے بہ الفاظِ دیگر دوسروں کے ذہنی غلام بن جائیں گے اور اس غلامی کی قیمت کاروبار میں ناکامی کی صورت میں ادا کرنی پڑے گی۔ کاروبار کی طرح ملازمت میں ترقی کا انحصار بھی اسی پر ہے کہ آپ قوتِ تمیز رکھتے ہوں۔ اگر آپ کو کسی دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ حاکمِ اعلیٰ کو ایک گھنٹے میں بیسیوں چھٹیوں پر دستخط کرنے پڑتے ہیں۔ وہ ہر چٹھی کو پڑھتا ہے نفسِ مضمون کے متعلق اسسٹنٹ سے مبادلۂ خیالات کرتا ہے۔ اگر محسوس کرتا ہے کہ اسسٹنٹ نے چٹھی پر جو کارروائی کی ہے وہ درست ہے تو دستخط کر دیتا ہے۔ اگر کوئی سقم ہو تو اس سے اسسٹنٹ کو خبردار کر دیتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ کیا کارروائی کی جائے۔ اگر یہ افسر قوتِ فیصلہ سے محروم ہو، ایک چھٹی لے بیٹھے اسسٹنٹ سے پوچھے کہ اس نے کیا کارروائی کی ہے۔ مگر فیصلہ نہ کر پائے کہ وہ کارروائی صحیح ہے یا نہیں۔ پھر کسی اور سے مشورہ کرے۔ اس پر بھی مطمئن نہ ہو تو دوسری برانچ کے انچارج کا مشورہ طلب کرے۔ غرض ایک چٹھی کا بکھیڑا گھنٹے دو گھنٹے تک ختم نہ ہو تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی افسری چند روزہ ہے اور وہ دن دور نہیں جب یہ افسری رہے گی نہ یہ شان و شوکت۔ اس کی جگہ وہ آدمی لے گا جو قوتِ فیصلہ رکھتا ہے۔

شخصیت کی تعمیر کے لیے فراست اور حکمت عملی بھی اسی قدر ضروری ہیں جس قدر جدّت پسندی۔ آپ نئی نئی تجاویز پیش کر سکتے ہیں، فوراً فیصلہ کر لیتے ہیں لیکن فیصلے کو لباسِ عمل پہنانے کے لیے دوسروں کے دلی تعاون کی ضرورت ہے۔ اس تعاون کے حاصل کرنے کا تعلق فراست اور حکمتِ عملی سے ہے۔ میں کسی گزشتہ باب میں بتا چکا ہوں کہ دوسروں کی امداد اور مشوروں کے محتاج نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ساری دُنیا سے بگاڑ لیجیے۔ کوئی آپ کے بھلے کی کہتا ہے تو اسے مسترد کر دیجیے۔ اگر آپ قیادت چاہتے ہیں، سیاسی اور کاروباری قیادت تو آپ کو یہ فن بھی سیکھنا پڑے گا کہ دوسروں کو اپنا کیونکر بنایا جاتا ہے اور ان کا تعاون کس طرح حاصل کیا جاتا ہے۔ اگر آپ ان لوگوں کو جو آپ کے ماتحت ہیں، حقیر، ذلیل اور نالائق سمجھیں گے، ان کی سیدھی بات کو اُلٹا سمجھیں گے، ان کے مشوروں اور تجاویز کو محض اس لیے درخورِ اعتنا نہ سمجھیں گے کہ وہ آپ سے جونیئر ہیں، چاہیں گے کہ وہ آپ کی پرستش کریں، جہاں دیکھیں جھک کر سلام کریں۔ شام کے وقت آپ کا ماتحت اپنے دوستوں کے ساتھ باغِ جناح میں سیر کر رہا ہے، ادھر سے آپ آ نکلتے ہیں، ماتحت کترا کر نکل جاتا ہے یا اس کا سلام جذبۂ عبودیت سے خالی ہے تو آپ کا پارہ چڑھ جاتا ہے اور آپ اگلے روز دفتر میں اسے اس قصور پر سرزنش کرتے ہیں تو سمجھ لیجیے کہ آپ کی حالت اصلاح طلب ہے۔ آپ کا ماتحت آپ کا ذاتی ملازم تو ہے نہیں کہ آپ اس سے اس قسم کی توقعات رکھیں۔ علاوہ بریں اگر آپ خوشامد پسند بن گئے تو وہ لوگ جنھیں آپ سے واسطہ پڑتا ہے، آپ کی اس کمزوری سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ

دفتر کا کام کرنے کے بجائے آپ کے قصیدے تصنیف کرتے رہیں گے۔ اس کی سزا آپ کو اس وقت بھگتنا پڑے گی جب سالانہ پرتال ہوگی۔

ماتحتوں سے حسنِ سلوک کا مفہوم یہ نہیں کہ انھیں سر پر چڑھا لیا جائے، ان کی غلطیوں پر ان سے بازپرس نہ کی جائے، ان کے نقائص پر انھیں ٹوکا نہ جائے۔ ایسے افسر کے متعلق خیال کیا جائے گا کہ وہ نالائق اور نااہل ہے۔ ایسے ہی افسروں کو ذمہ داری کے عہدوں سے ہٹا کر دوسروں کا ماتحت بنایا جاتا ہے اور ان کی سروس بک میں لکھ دیا جاتا ہے کہ انھیں کبھی ذمہ داری کا عہدہ نہ دیا جائے۔ کامیاب افسر وہی ہوگا۔ جو افراط و تفریط دونوں سے بچ کر رہتا ہے۔ وہ درشت بنتا ہے نہ ضرورت سے زیادہ نرم بلکہ اعتدال کی راہ پر گامزن رہتا ہے۔ آج کل کاروباری اداروں میں وہی آدمی ترقی کر سکتا ہے جو میانہ روی کو شعار بناتا ہے اور ازروئے حکمتِ عملی دوسروں سے کام لے سکتا ہے۔ آج کا کارکن زیادہ بیدار ہے، اس کی شیرازہ بندی ہو چکی ہے، اس کی یونین موجود ہے جو اس کے حقوق کی محافظ ہے۔ اگر کوئی افسر کارکنوں پر سختی کرتا ہے تو کارکن ہڑتال کر کے اس کا ناطقہ بند کر دیتے ہیں۔ بسا اوقات مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اس افسر کو برطرف کر دیا جائے، اور کارخانہ دار مجبوراً ان کے مطالبے کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ اس لیے دوسروں سے کام لینے کی اہلیت کو ترقی کا آئینہ سمجھنا بے جا نہیں۔

میرا ایک دوست دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں ایک ڈپو میں ملازم تھا۔ وہ بتاتا ہے، اس نے محنت کش طبقے سے کام لینے کے سلسلے میں یہ تجربہ حاصل کیا ہے کہ جو افسر قلیوں کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگاتا، انھیں یقین دلا دیتا ہے کہ وہ ان کا ہمدرد ہے،

وہ کامیاب رہتا ہے۔ اُڑے وقت پر ان سے دُگنا کام لے سکتا ہے۔ اس نے اپنے ڈپو کا ایک دلچسپ واقعہ سنایا جسے میں اسی کے الفاظ میں پیش کرتا ہوں؛

"اس ڈپو میں ڈیڑھ دو درجن افسر اور کئی ہزار قلی کام کرتے تھے۔ ان افسروں میں سے کچھ غیر ملکی تھے۔ وہ قلیوں پر تشدّد کیا کرتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی دیسی افسر بھی بوٹ کی ٹھوکروں سے قلیوں کی مرمت مقدس فرض گردانتے لگے۔ میں خود ستائی تو نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے ٹھوکر تو کجا، ان کے جذبات کو بھی کبھی ٹھیس نہ لگائی، کبھی بد کلامی سے پیش نہ آیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ان سے کام نہ لیا کرتا تھا۔ جہاں تک کام کا تعلق ہے میں ان کی رعایت نہ کیا کرتا تھا بلکہ دوسروں سے کچھ زیادہ ہی کام لیا کرتا تھا۔ اس پر بھی وہ مجھ سے خوش تھے محض اس لیے کہ میں انھیں ڈھور ڈنگر نہ سمجھتا تھا۔ وہ میرا بے حد احترام کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ڈپو میں پانچ بجے کے بعد ایک کام ایسا آ پڑا کہ اگر اسے سات بجے تک ختم نہ کیا جاتا تو اس کا نتیجہ بہت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ڈپو کے اعلیٰ افسر نے ان افسروں کو جو مرکزی دفتر کے قریب تھے، بلایا اور صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد کہا کہ وہ اپنے قلی لے کر فوراً فلاں مقام پر پہنچ جائیں۔ اس وقت کام تقریباً بند ہو چکا تھا اور قلی ڈپو سے باہر جانے کے لیے تیار ہو چکے تھے جب انھیں بتایا گیا کہ انھیں ابھی دو گھنٹے اور کام کرنا ہے تو وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ دن بھر کے تھکے ماندے تھے ہی، اس پر انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان دو گھنٹوں کی مزدوری نہ ملے گی۔ پھر وہ اپنی جان کیوں مارتے؟ انھوں نے کام کرنے سے رسمی انکار تو نہ کیا لیکن عملاً منکر تھے۔ جب افسر انھیں مقام مقررہ پر چلنے کو کہتے تو ادھر ادھر بھاگ جاتے۔ اب صورت حال

یہ ہے، افسر کوشاں ہیں کہ وہ مزدوروں کو ہانک کر مقررہ مقام تک لے چلیں، مگر قلی ہیں کہ قابو میں نہیں آتے اور بھاگ بھاگ جاتے ہیں۔

"یہ کش مکش آدھ گھنٹے تک جاری رہی۔ اعلیٰ افسر مقررہ مقام پر قلیوں کا انتظار کر رہا ہے مگر وہاں ایک بھی قلی نہیں پہنچا۔ وہ آدھ گھنٹے تک افسروں اور قلیوں کی آنکھ مچولی دیکھتا رہا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا مگر کر ہی کیا سکتا تھا۔ افسر بیچارے کیا کریں؟ کم بخت قلی راہ پر نہ آئیں تو کیا وہ خود کام کریں؟ قریب تھا کہ اعلیٰ افسر حواس کھو بیٹھتا۔ یکایک اسے خیال آیا کہ اس ڈپو میں ایک افسر موجود ہے جو یہ کام انجام دے سکتا ہے۔ وہ جیپ لے کر فوراً میرے پاس پہنچا، مجھ سے امداد طلب کی، کہنے لگا "یہ میری اور ڈپو کی عزت کا سوال نہیں بلکہ کئی ہزار انسانوں کی سلامتی کا مسئلہ ہے۔ اگر ہم وقت مقررہ کے اندر کام ختم نہ کر سکے تو دشمن ہمارے سپاہیوں کو چن چن کر قتل کر دے گا۔" یہ سن کر میں نے پانچ سو قلیوں کے سرداروں کو ڈرتے ڈرتے بلایا اور صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ڈرتے ڈرتے اس لیے کہ جب ڈپو کے باقی قلیوں اور ان کے سرداروں نے کام کرنے سے عملاً انکار کر دیا ہے تو وہ میری بات کیوں ماننے لگے؟ مجھے یقین نہ تھا کہ وہ قلی جو ایک روپیہ روز پر سارا دن مشقت کا کام کرتے رہے ہیں، دو گھنٹے مزید کام کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ جب وہ آگاہ ہیں کہ انھیں اس کام کی اجرت بھی نہ ملے گی۔ لیکن میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس سردار نے کہا "حضور! کوئی اور ہوتا تو ہم ایک لمحے کے لیے بھی کام نہ کرتے۔ اگر بڑا صاحب بھی کہتا، تو یوں کا منہ ہماری طرف پھیر دیتا تو بھی ہم پانچ بجے کے بعد ڈپو میں ایک لمحے کے لیے نہ ٹھہرتے لیکن آپ کا فرمان نہیں ٹال

سکتے؟" اور اس نے سب تھیلیوں کو دو چار منٹ میں جمع کیا اور مقام مقررہ کی طرف چل پڑا۔ انھیں دیکھ کر باقی کے قلی بھی آ گئے اور کام پون گھنٹے میں ختم ہو گیا۔"

ڈپو کا اعلیٰ افسر میرے دوست پر اتنا خوش ہوا کہ اس نے اس کی ترقی کی پُرزور سفارش کی اور اس وقت تک چین نہ لیا جب تک اُس کی ترقی کے احکام موصول نہ ہو گئے۔ میرے دوست کی کامیابی کا راز کیا تھا؟ دوسروں سے کام لینے اور ان کا تعاون حاصل کرنے کی استعداد۔ آپ کیونکر کامیاب ہوں گے؟ اپنے آپ کو اس قابلیت سے آراستہ کرنے کے بعد۔

کامیابی کے لیے اخلاقِ حسنہ ضروری تو نہیں۔ دُنیا میں ایسے لوگ بھی کامیاب ہوئے ہیں جو بداخلاق تھے، ظالم تھے، نوعِ انسان کے دشمن تھے۔ لیکن میں اس فتح کو شکست، اس کامیابی کو نامرادی کہتا ہوں جو یتیموں، بے کسوں اور کمزوروں پر ظلم و ستم کر کے حاصل کی جائے، جس کا مقصد انسانیت کی بہبود نہ ہو بلکہ عیش و تنعم کے لیے زر و سیم جمع کرنا ہو، اقتدار کی ہوس ہو۔ ہمارا فرض صرف یہی نہیں کہ ہم اپنے اور اپنی اولاد کے لیے دولت، عزت اور مناصب حاصل کریں بلکہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے حصے کا کام انجام دینا بھی ہمارا فرض ہے اور غالباً مقدس ترین فرض۔ ہم انسان ہیں، اس قبیلے کے رکن ہیں، اس کل کے جزو ہیں جس نے خدا کی کائنات کو بہتر، خوبصورت اور بہشت بنانے کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ ہماری دُنیا نے اب تک جو ترقی کی ہے وہ ہمارے بزرگوں کا کارنامہ ہے۔ ہم ان کی محنت کا ثمرہ حاصل کر رہے ہیں اس لیے ہمارا فرض ہے کہ یہ کارِ خیر جاری رکھیں اور اسے اور بہتر بنائیں۔

انسان ابھی تک شکارِ مصائب ہے۔ قومیں ابھی تک ہوسِ اقتدار کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ان کی یہی ہوس دس بیس سال بعد جنگ کی بھٹی گرم کر دیتی ہے جو نسلِ انسانی کے لیے طرح طرح کی مصیبتیں لاتی ہے۔ قحط، وبائیں، طوفان، حوادث ابھی تک نوعِ انسان کو تنگ کرتے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانیت کی تکمیل نہیں ہوئی۔ وہ ابھی تک ان دیکھے مستقبل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہ پیش قدمی بلا وجہ، بلا سبب نہیں۔ انسانیت کا نصب العین کیا ہے؟ بدی کا استیصال اور فنا کو فنا کرنا۔ یوں ایک ایسی جنت بسانا جہاں امن، انصاف اور راحت کا دور دورہ ہوگا، وہ لیڈر جنھیں انسانیت کی بہبود عزیز ہے کہتے ہیں کہ دنیا سے وبائیں، قحط اور جنگ و جدل ختم کیے بغیر انسان سکھی نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم ترقی کی راہ طے کرتے وقت اس ضابطۂ اخلاق کی پابندی کریں جو انسانیت کی بہبود کے لیے ہے۔ راست بازی، دیانت داری، دوسروں سے ہمدردی، ایثار ایسے فضائل ہیں کہ وہ کامیابی کا راستہ مسدود نہیں کرتے۔

دنیا میں ایسے انسان ہو گزرے ہیں جنھوں نے دیانتدار رہ کر کامیابی حاصل کی۔ قائدِ اعظم کی دیانتداری مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ پھر کیا دیانتداری نے ان کا راستہ روکا؟ راستی دیانت داری کی توام بہن ہے، ہمدردی انسانیت کا زیور ہے، درگزر شیوۂ پیغمبری ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے انسانیت کی خدمت کی، ان اوصافِ حمیدہ سے متصف تھے۔ اس لیے ہمیں اپنے آپ کو ان افراد کی شخصیت کے سانچے میں ڈھالنا چاہیے جو صرف کامیاب نہ تھے، انسان بھی تھے۔

عزم وثبات

۱۔ ہمّت و استقلال

انسانی زندگی کی تعمیر میں خیالات کیا پارٹ ادا کرتے ہیں؟ اس پہ تفصیلی بحث
کی جا چکی ہے۔ اگر آپ کامیابی کا رُخِ روشن دیکھنا چاہتے ہیں، تو من کی دُنیا میں
انقلاب لائیے۔ بلند خیال بنیے۔ اپنے آپ کو پہچانیے۔ ان چیزوں کے متعلق سوچیے
جنھیں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کے سوانحِ حیات، کا مطالعہ کیجیے جن کی
زندگی کی صبح سوگوار تھی مگر شباب، اور شام کو انھوں نے ذاتی سعی سے شاندار
بنا لیا۔ ان سا بننے کی کوشش کیجیے۔ تصور میں ان منازل کو قطع کیجیے جنھیں ان
لوگوں نے طے کیا لیکن آپ کے خیالات کامیابی کی شکل مجسّم اس وقت بنیں گے۔
جب آپ عملی اقدام بھی کریں گے۔ خیالات کو شمع سمجھیے جو آپ کے ساتھ ساتھ
چلتی اور راستے کا اندھیرا دور کرتی ہے۔ جہاں تک پیش قدمی کا تعلق ہے وہ آپ ہی
کو کرنی ہوگی۔ قدم آپ ہی کو بڑھانے پڑیں گے۔ راہ کی رکاوٹوں کو اپنے ہاتھوں سے
دور کرنا پڑے گا۔ جب تھک کر چُور ہو جائیں گے، آگے چلنے کی سکت نہ رہے گی؛
قدم من من کے ہو جائیں گے، جی چاہے گا کہ سایے میں لمبی تان کر سو جائیں اور میٹھی
نیند کے مزے لیں۔ اس وقت ہمّت مردانہ ٹوکے گی ضرور، قوتِ ارادی مشورہ ضرور
دے گی کہ سونا کھونا ہے، غفلت کے معنی ہیں شکست اور ذلّت لیکن آگے بڑھنے کی

تکلیف آپ کے جسم ہی کو برداشت کرنی پڑے گی۔

" جو سوچتے ہیں وہ کر سکتے ہیں " فی الواقع کر سکتے ہیں۔ لیکن بار بار اس جملے کے دہرانے سے نہیں بلکہ ہاتھ پاؤں ہلانے سے۔ آپ کے والدین مفلس تھے۔ وہ آپ کو اعلیٰ تعلیم نہیں دلا سکے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے تہیہ کر لیا ہے کہ ڈگری حاصل کر کے رہیں گے تو ڈگری آپ کو مل کر رہے گی۔ آپ پہلے انسان نہیں جس نے اس قسم کا عزم کیا ہو۔ پاکستان میں اس وقت بیسیوں افراد موجود ہیں جن کے والدین آپ کے والدین کی طرح غریب تھے۔ اس لیے انھیں اعلیٰ تعلیم نہ دلا سکے مگر وہ ڈگری پائے ہوئے ہیں۔ وہ کسی کالج میں داخل نہیں ہوئے، انھوں نے کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا مگر گریجوبٹ ہیں۔ ہمارے کالجوں میں بہت سے پروفیسر ایسے ہیں جو کسی کالج کے فارغ التحصیل نہیں۔ ایک لیکچرار کے متعلق تو میں خود جانتا ہوں کہ اس نے ابتدائی تعلیم بھی شاید ہی مدرسے میں حاصل کی ہو مگر آج وہ دو تین مضامین میں ایم۔ اے کی ڈگری رکھتا ہے اور پی۔ ایچ۔ ڈی ہے۔ مجھے ہائی سکول کے ایک ہیڈ ماسٹر کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہ ابھی بچہ ہی تھے کہ ایک سکول میں چپراسی بھرتی ہوئے۔ استاد نے دیکھا کہ بچہ ذہین ہے تو اسے اجازت دی کہ وہ کام کاج سے فارغ ہو کر مدرسے کے دوسرے بچوں کے ساتھ سبق پڑھ لیا کرے۔ اس نے اس رعایت سے پورا فائدہ حاصل کیا اور اتنی ترقی کی کہ بعد میں اسی گورنمنٹ ہائی سکول کا ہیڈ ماسٹر بنا۔ چند سال پہلے مجھے کوآپریٹو سوسائٹی کے ایک سرکل رجسٹرار سے ملاقات کا موقع نصیب ہوا۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ پرائمری پاس ہیں۔ وہ اس وقت بھی ڈگری پائے ہوئے تو نہ تھے مگر شستہ انگریزی

میں رپورٹ مرتب کر سکتے اور انگریزی میں تقریر کر سکتے تھے۔

لاہور میں مجھے ایک بار ایک شناسا ملا۔ وہ ایک پرائمری مدرسے میں اوّل مدرّس تھا۔ اس سے دریافت کیا کہ لاہور کس غرض سے آیا ہے تو اس نے بتایا کہ وہ بی۔ ٹی کا سٹوڈنٹ ہے۔ اس نے پہلے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد صرف انگریزی کی تیاری کر کے ڈگری حاصل کر لی اور اب بی۔ ٹی میں پڑھتا ہے۔

اگر یہ لوگ گریجویٹ بن سکتے ہیں۔ ڈگری حاصل کر سکتے ہیں۔ اتنی قابلیت بہم پہنچا سکتے ہیں کہ شستہ انگریزی لکھ سکیں، اور انگریزی میں تقریر کر سکیں تو آپ کیوں گریجویٹ نہیں بن سکتے؟ لیکن ہوگا یہ اسی صورت میں جب آپ بھی اُن کی مانند راتوں کو جاگنا اور مطالعے کو شعار بنائیں گے۔ اگر پہلی سعی مشکور نہ ہوئی تو گھبرا نہ جائیں گے بلکہ استقلال سے کام لیں گے۔ پھر کوشش کریں گے۔ آرام و آسائش کا خیال صرف اس حد تک کریں گے، جہاں تک وہ صحت کے لیے ضروری ہے۔ لہو و لعب سے مجتنب رہیں گے، پھر کامیابی آپ ہی کی ہوگی۔

اگر آپ کسی ادارے میں ملازم ہیں۔ مدت سے ایک گریڈ میں کام کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ کو اعلیٰ گریڈ دیا جائے تو پہلے اس بات کا جائزہ لیجیے کہ آپ اب تک ترقی سے کیوں محروم رہے۔ کیا اس کی وجہ آپ کی سہل انگاری تو نہیں ہے؟ آپ دفتر میں بادلِ ناخواستہ جاتے ہیں۔ اپنا کام بے دلی سے کرتے ہیں۔ دفتر سے جلد بھاگنے کی ٹھان لیتے ہیں۔ بار بار گھڑی دیکھتے ہیں کہ کب چار بجیں اور آپ اس عذاب الیم سے نجات حاصل کریں۔ اس پر یہ توقع کہ آپ کو ترقی کا سزاوار سمجھا جائے۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کہ اگر آپ نے ہمت و استقلال سے کام لے کر اپنی یہ عادات

دور نہ کیں تو بعد میں بھرتی ہونے والے کلرک اگلا گریڈ حاصل کرتے رہیں گے مگر آپ کی باری کبھی نہ آئے گی۔ اس لیے گریڈ لینا ہے تو اپنی غلط روی کا احساس کیجیے۔ کام میں دل لگائیے۔ اپنی معلومات وسیع کیجیے۔ سالانہ رپورٹ لکھتے وقت یہ نہ سمجھیے کہ آپ کی بلا کو ٹالنا ہے بلکہ یہ خیال کیجیے کہ اپنی قابلیت کا مظاہرہ کرنا ہے۔ غرض اپنے عمل سے ثابت کر دیجیے کہ آپ محنتی ہیں۔ ادارے کے خیر خواہ ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ آپ کو اعلیٰ گریڈ نہ دیا جائے۔

میں ایک نوجوان آرٹسٹ کو جانتا ہوں جو محنتی ہے، لائق ہے لیکن اس کی مالی حالت بہتر نہیں محض اس لیے کہ وہ مستقل مزاج نہیں۔ وہ زیادہ دیر تک ایک جگہ نہیں ٹھہرتا۔ ایک کام نہیں کرتا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جب برسرِ روزگار ہوتا ہے تو اپنے آرٹ سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ وہ چاہے تو دفتر کے اوقات کے بعد روزانہ دو تین گھنٹے محنت کرکے دو تین سو روپے ماہوار کما سکتا ہے۔ ایک بار مجھے اس کے یہاں ایک مہینے تک ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ اس نے میرے اکسانے پر ایک ماہ تک روزانہ رات کو دو گھنٹے کام کیا۔ جب وہ دفتر سے واپس آتا تو ہم سیر و تفریح کو نکل جاتے۔ واپس آکر کھانا کھاتے کے بعد میں کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور وہ اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ اس مہینے کے اواخر میں اسے مقررہ تنخواہ کے علاوہ تین سو روپے ملے۔ وہ بہت خوش ہوا اور اس نے وعدہ کیا کہ آئندہ ہر رات کو دو گھنٹے کام کا اصول فراموش نہ کرے گا لیکن میرے چلے آنے کے بعد پھر وہی کاہل انگاری۔ آج کل پھر بے روزگار ہے۔ مجھ سے ملاقات ہوئی تو میں نے مشورہ دیا کہ وہ ملازمت کا خیال چھوڑ دے اور اپنا کاروبار شروع کر دے تو کہنے لگا "سرمایہ نہیں"۔ میرا دھیان فوراً اس کی ایک ماہ کی فالتو آمدنی کی طرف گیا۔ یہ

آرٹسٹ چار سال تک معقول مشاہرے پر ملازم رہا ہے۔ اگر وہ تنخواہ سے ایک پیسہ نہ بچاتا۔ مگر دفتر کے اوقات کے بعد دو گھنٹے کام کر کے جو رقم حاصل کرتا اسے بنک میں جمع کراتا رہتا تو آج وہ سرمایہ نہ ہونے کی شکایت نہ کرتا اور اپنا کاروبار شروع کرنے میں اسے دقت محسوس نہ ہوتی۔

یہ آرٹسٹ امیر ہے۔ خدا نے اسے دولت دے رکھی ہے۔ یہ اگر اب بھی عزم و ثبات سے کام لے تو پانچ سات سو روپے ماہانہ کما سکتا ہے۔ لیکن ملازمت کے لیے مارے مارے پھر رہا ہے کیونکہ یہ پابندی سے کام کرنے کا عادی نہیں۔ یہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہی نہیں۔ مجھے یقین نہیں کہ یہ آرٹسٹ کبھی فارغ البال بن سکے گا۔ کیونکہ جو دولت اس کے پاس ہے اسے کام میں نہیں لاتا۔

میرے وطن کے اکثر نوجوان مشاہرے کی قلت کا رونا روتے ہیں لیکن آمدنی بڑھانے کے وسائل اختیار نہیں کرتے۔ اس نوجوان کی طرح خدا نے انھیں امیر پیدا کیا ہے لیکن اپنی قدر و قیمت سے آگاہ نہیں یا پھر اپنے ہنر کو روپوں میں منتقل کرنے کے لیے جس استقلال کی ضرورت ہوتی ہے اس سے محروم ہیں۔ انھیں کہا جائے کہ وہ جو وقت خوش گپیوں میں ضائع کرتے ہیں۔ اس میں مفید کام کریں۔ علم و ادب سے شغف ہے تو تصنیف و تالیف کو ذریعۂ آمدنی بنائیں۔ مصوری سے رغبت ہے تو تصویر کشی میں باکمال بنیں۔ تعلیم و تعلّم سے مناسبت ہے تو اسے بھی آمدنی کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ غرض کوئی نہ کوئی کام ضرور کیا جائے تو وہ لایعنی عذر پیش کرنے پر تیار رہتے ہیں۔ یہ مشورہ ان لوگوں کے لیے ہے جو مالی مشکلات میں گرفتار ہیں۔ جو لوگ موجودہ مشاہرے میں گزارہ کر سکتے ہیں انھیں اپنا وقت اپنے فن کی تکمیل میں صرف کرنا چاہیے۔

اگر وہ صحافی ہیں اور کسی اخبار میں مدیر معاون ہیں تو مدیر اعلیٰ بننے کی اہلیت پیدا کریں۔ کسی ادارے میں سینئر کلرک ہیں تو اپنے آپ کو اس کا مینجر بننے کے لیے تیار کریں آج کل ہر علم و فن کے لیے مفید لٹریچر شائع ہوتا رہتا ہے۔ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ کلرکی کے زمانے ہی میں کماحقہٗ آگاہی حاصل کی جائے کہ مینجر کو کیا فرائض انجام دینے پڑتے ہیں اور وہ انھیں کیونکر انجام دیتا ہے تاکہ جب موقع ملے تو اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

انسانی زندگی میں مواقع بڑی سرعت سے آتے اور گزر جاتے ہیں۔ جو لوگ ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے پہلے سے تیار رہتے ہیں وہ انھیں حاصل کر لیتے ہیں اور جو لوگ کہتے ہیں کہ جب موقع آئے گا تو دیکھا جائے گا وہ مُنہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

یونان کے کسی مجسمہ ساز نے موقع کا ایک بُت بنایا جس کے سر کے اگلے حصّے پر لمبے لمبے بال تھے مگر گدّی صفاچٹ تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں شمشیر برہنہ تھی اور وہ پَر کھولے پنجوں کے بل کھڑا تھا۔ جب ایک شاعر نے وہ مجسمہ دیکھا تو اس سے دریافت کیا۔

س : تمھارے پَر کیوں کھُلے ہیں؟

ج : یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ہر وقت پرواز کے لیے تیار رہتا ہوں۔

س : تمھارے ہاتھ میں تلوار کیوں ہے؟

ج : یہ بتانے کے لیے کہ میں اس کی دھار سے بھی تیز ہوں۔

س : تمھارے سر کے اگلے حصّے پر بال کیوں ہیں؟

ج : تاکہ جو کوئی مجھے سامنے سے پکڑنا چاہے پکڑ سکے۔

س : مگر گُدّی بالوں سے کیوں خالی ہے ؟

ج : یہ بتانے کے لیے کہ جب میں ایک بار آگے نکل جاتا ہوں تو کوئی مجھے پیچھے سے نہیں پکڑ سکتا۔

س : تجھے مجسمہ ساز نے ایسا کیوں بنایا ؟

ج : اے شاعر ! ان لوگوں کو سبق دینے کے لیے جو مواقع ضائع کرتے رہتے ہیں۔

ہمارے یہاں ایسے لوگوں کی کثرت ہے جو مواقع ضائع کرتے رہتے ہیں انھوں نے پہلے سے انھیں پکڑنے کی تیاری کبھی نہیں کی۔ جب وہ گزر جاتے ہیں تو لب بر شکایت وا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں "یہ سفارش کا زمانہ ہے۔ مجھ ایسا آدمی جو سفارش نہیں رکھتا، کیونکر کامیاب ہو سکتا ہے؟" کبھی ارشاد ہوتا ہے "بابا اندھیر ہو رہا ہے اندھیر۔ میں سب سے سینئر ہوں لیکن گریڈ دے دیا گیا ہے ایک جونئر کو، ایک نوخیز کو۔" وہ کبھی نہ بتائیں گے کہ اس جونئر نے ایک سال کے اندر اپنی قابلیت میں اضافہ کر لیا ہے۔ اگلے گریڈ کا امتحان پاس کر لیا ہے اور موقع کو سامنے سے پکڑنے کے لیے تیار ہو چکا ہے۔ ایسا کریں تو ان کی حقیقت کھُل جاتی ہے۔ وہ اپنے طور پہ جانتے ہیں کہ محکمے نے ان سے بے انصافی نہیں کی۔ وہ گریڈ تھا ہی اس آدمی کے لیے جو اس گریڈ کا امتحان پاس کرے۔ ایسے لوگوں کی شکایات کوئی نہیں سُنتا، نہ آئندہ کبھی ان کی شکایات کو درخورِ اعتنا سمجھا جائے گا کیونکہ وہ کام کیے بغیر انعام حاصل کرنا چاہتے ہیں جس کی اس دور میں گنجائش نہیں۔

زندگی کی شاہراہ بہت کٹھن ہے۔ موجودہ مشینی دَور میں روزگار حاصل کرنا یا ترقی

کے میدان میں دوسروں کو پیچھے چھوڑ جانا بہت دشوار ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ آپ باعزت روزگار حاصل کر سکیں اور ترقی کے مستحق سمجھے جائیں تو ہمت و استقلال سے کام لیجیے۔ معمولی ناکامیوں پہ دل نہ چھوڑ بیٹھیے جب آپ فتح کا عزم لے کر میدان میں نکلیں گے، رکاوٹوں کو دیکھ کر حوصلہ نہ ہار بیٹھیں گے بلکہ انھیں راہ سے ہٹانے کی جدوجہد کریں گے تو کامیاب ہو کر رہیں گے۔

ابراہیم لنکن کی کامیابی کا راز کیا تھا؟ مستقل مزاجی۔ جب اُس نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں غلامی کو خلاف قانون قرار دینے کا فیصلہ کیا تو جنوبی ریاستوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ جب لنکن نے ان کا مطالبہ نہ مانا تو انھوں نے جنوبی ریاستوں کی جداگانہ فیڈریشن بنانے کی دھمکی دی۔ جب یہ دھمکی بھی بے اثر رہی تو اعلانِ بغاوت کر دیا۔ اگر ابراہیم لنکن ثابت قدمی نہ دکھاتا تو یا تو ریاست ہائے متحدہ میں غلامی آج تک قانوناً جائز ہوتی یا پھر ریاست ہائے متحدہ امریکہ صرف شمالی ریاستوں کی فیڈریشن کا نام ہوتا مگر لنکن نے مستقل مزاجی سے کام لیا۔ نہ تو امریکہ میں غلامی کے جواز کی حامی بھری نہ جنوبی ریاستوں کو علیحدگی کی اجازت دی۔ جنوبی ریاستوں پر لنکن کا استقلال شاق گزرا۔ انھوں نے فی الواقع علمِ بغاوت بلند کر دیا اور عرصے تک شمالی ریاستوں کی فوج کا دلیرانہ مقابلہ کرتے رہے۔ اس دوران میں ایسے لمحات بھی آئے جب لنکن کو ہر طرف مایوسی کی گھٹائیں نظر آتی تھیں۔ ادھر دوست اور ساتھی مجبور کرتے تھے کہ وہ جنوبی ریاستوں سے صلح کرنے پر آمادہ ہو جائے، اُدھر میدانِ جنگ سے شکست کی خبریں موصول ہوتی تھیں لیکن عزم و استقلال کا پتلا لنکن ہراساں نہ ہوا۔ بالآخر فتح اس کے استقلال کو ہوئی۔

برطانیہ کے مشہور ڈرامہ نویس جارج برنارڈ شا پرلے درجے کے مستقل مزاج تھے۔ جب شا نے فیصلہ کیا کہ وہ ادبی دنیا میں اپنی جگہ بنائیں گے اور ادیب کی حیثیت سے شہرت حاصل کریں گے تو ایڈیسن ٹیلیفون کمپنی کی ملازمت چھوڑ دی اور اپنے شب و روز کتب خانوں اور ادبی محفلوں میں بسر کرنے شروع کر دیے۔

اس عرصے میں برنارڈ شا نے متعدد ناول لکھے لیکن ان سے کوئی آمدنی نہ ہوئی کوئی اور ہوتا تو مایوس ہو جاتا مگر شا کسی اور مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ وہ برسوں تک تنگی ترشی میں وقت بسر کرتے رہے لیکن حوصلہ قائم رکھا۔ بالآخر ان کے استقلال نے ان پر کامیابی کے دروازے کھول دیے۔ وہ بیسویں صدی کے بڑے ڈرامہ نویس بن کر رہے اور کتابوں کے ذریعے سے لاکھوں پونڈ کمائے۔ ان کی کامیابی رہینِ منت ہے عزم و ثبات کی۔ ان کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ ہر روز پانچ صفحے ضرور لکھا کرتے تھے۔ لطف یہ کہ شروع شروع میں ان کی محنت کا کوئی معاوضہ بھی نہ ملتا۔ یہی باقاعدگی اور استقلال ان کی کامیابی کا زینہ بنا۔

دو نوجوان آج سے دس سال پیشتر ایک ادارے میں ملازم ہوتے ہیں۔ دونوں دو سال تک اس ادارے میں کام کرتے ہیں کہ انھیں ایک اور ادارے سے زیادہ مشاہرے کی ملازمت کی پیش کش کی جاتی ہے۔ ایک نوجوان مستقل مزاج بنتا ہے۔ سوچتا ہے کہ موجودہ ادارہ مشہور ہے، نیک نام ہے۔ اسے چھوڑ کر ایک ایسے ادارے میں جانا جس کے متعلق پتا نہیں کس قسم کا ثابت ہو گا یا چلتا بھی ہے یا ناکام ہوتا ہے دانشمندی سے بعید ہے۔ اگر نیا ادارہ معقول مشاہرے کی پیش کش کر رہا ہے تو موجودہ ادارے میں بھی ترقی کا موقع ضرور ملے گا۔ یہ سوچ کر وہ اس

پیش کش کو ٹھکرا دیتا ہے۔ مگر دوسرا نوجوان جذباتی ہے۔ وہ ان باتوں کو نہیں سوچتا اور نئے ادارے سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ وہ نوجوان جو مستقل مزاج تھا، اسی ادارے میں رہ کر نام پیدا کر چکا ہے، دوسرا کہیں بھی مستقل طور پر نہیں ٹھہرتا۔ آج ایک ادارے میں کام کر رہا ہے تو کل دوسرے میں۔ کبھی ایک شہر کو اپنا مستقل ہیڈ کوارٹر بناتا ہے تو کبھی دوسرے کو۔ وہ آج تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ اس کے خوابوں کی تعبیر کس شہر میں ہونی چاہیے۔ جہاں تک قابلیت کا تعلق ہے دونوں قابل ہیں۔ مگر وہ نوجوان جو مستقل مزاجی کو شعار بناتا ہے۔ آج پانسو روپے ماہوار مشاہرہ لے رہا ہے اور آخر الذکر نوجوان تلاشِ معاش میں سرگرداں ہے کیونکہ مستقل مزاج نہیں۔

ایک شاعر کہتا ہے :-

ہمّت بلند دار کہ نزدِ خدا و خلق

باشد بقدرِ ہمّتِ تو اعتبارِ تو

شاعر بالعموم زودن کی لیا کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی وہ حقائق کو بھی بے نقاب کرتے ہیں، حقائق جن کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ شاعر ہمیں بلند ہمتی کی تلقین کرتا ہے تو غلط بیانی سے کام نہیں لیتا۔ فی الواقع ہماری ساکھ ہماری ہمت سے بنتی ہے "خدا ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں" مشہور مقولہ ہے۔ الہامی کتب میں انسان کو بار بار ہدایت کی گئی ہے کہ وہ کوشش کریں۔ نیکی کی تبلیغ و اشاعت میں صبر اور حوصلہ قائم رکھیں۔ کامیابی ان کے لیے ہے جو باہمت ہیں۔ انعام انھیں ملتا ہے جو صاحبانِ عزم و ثبات ہیں۔ دنیا کے کامیاب افراد کے

سوانح حیات کا مطالعہ کیجیے۔ تاریخ کے اوراق اُلٹیے۔ مختلف ممالک کی جدوجہد آزادی کا مطالعہ کیجیے۔ آپ پر یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ کامیاب وہی لوگ ہوتے ہیں جو مستقل مزاج تھے جو مشکلات کو خاطر میں نہ لائے ان کی مساعی بارآور ہوکر رہیں کیونکہ لوگ انھیں کا ساتھ دیتے ہیں، انھیں کی قیادت پسند کرتے ہیں جو ہمت والے ہوں۔ بزدلوں کی چیخ پکار ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ جو لیڈر میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں، مشکلات سے ڈر کر طاغوتی طاقتوں سے ٹکر لینا نہیں چاہتے انھیں کوئی منہ نہیں لگاتا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے کئی صدر غریب گھرانوں میں پیدا ہوئے۔ وہ بام عروج تک پہنچے تو ذاتی کوشش، اَن تھک مساعی اور ناقابل شکست استقلال کی برکت سے۔ انھیں اپنا راستہ بناتے وقت قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر وہ راستہ بناکر رہے۔ وہ دوسروں کے اشاروں پر اصول نہ بدلا کرتے تھے بلکہ دوسروں سے اپنے اصول منوانے کے لیے ڈٹ جایا کرتے تھے۔

امریکہ کے ایک مشہور لیڈر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ شہرت حاصل کرنے سے بہت عرصہ پہلے ایک ہفتہ وار اخبار کا مالک اور مدیر تھا۔ اس نے ایک بار اپنے اخبار میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا جسے شہر کے متمول طبقے نے پسند نہ کیا۔ انھوں نے اخبار کے مدیر کو اپنی راہ پہ لانے کی کوشش کی لیکن اس نے ایک نہ مانی۔ اس پر متمول طبقے نے باہمی مشورے سے اس کا اخبار خریدنا بند کردیا۔ ان کا خیال تھا کہ مالی مجبوریاں مدیر کو ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کردیں گی۔ بادی النظر میں ان کی کامیابی یقینی تھی۔ اگر وہی لوگ جو اخبار خریدنے کی استطاعت

رکھتے ہوں اسے خریدنا بند کر دیں تو اخبار کیونکر جاری رہ سکتا ہے؟ لیکن وہ مدیر خوفزدہ نہ ہوا اور اس نے شہر کے متموّل طبقے کو ایسا سبق دیا کہ وہ نہ صرف اس کا اخبار پھر سے خریدنے لگے بلکہ پھر اس سے کبھی اُن کی مرضی پہ چلنے کا مطالبہ نہ کیا۔

کیونکر؟

بیان کیا جاتا ہے کہ اس اخبار نویس نے شہر کے معززین کو کھانے کی دعوت دی۔ وہ خوش تھے کہ اخبار نویس ڈر گیا ہے اور انھیں راضی کرنا چاہتا ہے۔ وہ خوش خوش دعوت میں شامل ہوئے۔ جب کھانے کے کمرے میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہر آدمی کے لیے ایک ایک پلیٹ اور پانی کا گلاس موجود ہے۔ ہر پلیٹ سفید رومال سے ڈھکی ہے۔

اخبار نویس نے حاضرین سے کہا کہ وہ کھانا شروع کر دیں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی پلیٹ سے رومال ہٹایا اور سوکھے بسکٹ کھانے شروع کر دیے۔ یہ کھانا دیکھ کر امرا کو آگ لگ گئی۔ انھوں نے سمجھا کہ اخبار نویس نے ان کی اہانت کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہے۔ سب شعلہ بار نظروں سے اخبار نویس کو جو سوکھے بسکٹ بڑے شوق سے کھا رہا تھا، دیکھنے لگے اور جب وہ کھانے سے فارغ ہوا تو اس نے امرا کو خطاب کیا کہ جو انسان سوکھے بسکٹ کھا کر گزارہ کر سکتا ہے اسے آپ خرید سکتے ہیں نہ مرعوب کر سکتے ہیں۔ یہ سُن کر امرا نادم ہوئے۔ انھوں نے پھر کبھی اسے اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش نہ کی۔ یہ اخبار نویس آخر میں امریکہ کا مشہور لیڈر بنا۔ اگر وہ امرا کی دھمکی میں آ جاتا اور حق گوئی چھوڑ دیتا، استقلال سے کام نہ لیتا تو غالباً ساری عمر اسی شہر میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا رہتا اور تنورِ شکم کو گرم

رکھنے کے لیے امرا کی دہلیز پہ سجدے کرتا رہتا۔ اعلیٰ منصب کا تو وہ کبھی خواب بھی نہ دیکھ سکتا۔

علامہ اقبال جد و جہد اور ہمت و استقلال کی اہمیت سے آگاہ تھے جبھی تو وہ مسلمان کو جد و جہد پر اکساتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں کہ صاحب ہمت بنے۔ مشکلات کو خاطر میں نہ لائے۔ اس راہ پہ چلنا ہی گوارا نہ کرے جو بے خطر ہو۔ اپنے آپ کو پہچانے۔ وہ ہمیں ساحل پر بیٹھے دیکھتے ہیں تو خاموش نہیں رہ سکتے بلکہ چیخ اُٹھتے ہیں کہ زندگی ورکار ہے تو ساحل پہ بیٹھ کر لہریں نہ گنیے بلکہ دریا میں کود جائیے اور موجوں سے اُلجھیے۔ یہی زندگی ہے، یہی ہے حیاتِ جاوداں۔

اقبال صرف شاعر نہ تھے سیاستدان بھی تھے۔ وہ سیاست میں بھی "اپنی دُنیا آپ پیدا کرنے" کے قائل تھے۔ وہ دیر تک ان مسلمان لیڈروں کے ہم نوا نہ رہ سکے جو مرکز میں ایک تہائی اور پنجاب اور بنگال میں چھپن فی صد نشستیں طلب کر رہے تھے۔ اگر انڈین نیشنل کانگرس اُن لیڈروں کے کشکول گدائی میں نشستوں کی بھیک ڈال دیتی تو وہ اس کی غلامی کا جوا اپنے علاوہ تمام مسلمانوں کی گردن میں ڈالنے پر تیار تھے مگر اقبال اسے خسارے کا سودا سمجھتے تھے۔ دس کروڑ مسلمان بھیڑ بکریوں کا گلہ نہیں، ایک قوم ہیں جو جداگانہ تہذیب و تمدن رکھتے ہیں۔ وہ کبھی اس ملک کے بادشاہ تھے۔ مگر زمانے کا انقلاب دیکھیے کہ وہ ایک قوم کی غلامی سے نجات حاصل کر کے دوسری قوم کی غلامی قبول کرنے پر تیار ہیں۔ اقبال اس سیاست کو ہلاکت اور بربادی کے مترادف سمجھتے تھے۔ وہ مسلمان لیڈروں کو سمجھانے لگے کہ طلسم ہیچ مقداری میں گرفتار نہ ہو جیے۔ نشستوں کے تعیّن سے مسلمان کی حفاظت نہیں ہو سکتی

غنیمت جانیے کہ اکثریت نے آپ کا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا ورنہ اس برعظیم میں مسلمان کا وہی حشر ہوتا جو ہسپانیہ میں ہو چکا ہے۔ اس لیے اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط نہ کیجیے اور نشستوں کے بجائے علیحدہ وطن مانگیے۔ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ ان کے مالک بھی مسلمان ہیں، کوئی دوسری قوم ان کی مالک نہیں بن سکتی۔ یہ نکتہ وہ لیڈر کیونکر سمجھ سکتے جو گداگر بن چکے تھے جو کبھی انگریز سے کہتے تھے کہ ان کی حفاظت کا سامان کر کے اس سرزمین کو چھوڑنا، ہماری وفاؤں کا کچھ تو صلہ دے کر جانا اور کبھی اکثریت سے نشستوں کی بھیک مانگتے تھے۔ انھوں نے اقبال سے کہا، مسلمان کمزور ہیں۔ غیر منظم ہیں۔ وہ تنہا برطانوی ملوکیت اور منظم جماعت انڈین نیشنل کانگرس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جب اپنوں میں سے بھی کچھ انگریز کے ساتھ ہیں تو کچھ کانگرس کے غلام بے دام۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ان بڑی طاقتوں کے مقابلے کا خطرہ مول لینے کے بجائے ان سے خیرات چاہی جائے اور ایسا مطالبہ پیش کیا جائے جسے وہ مان سکیں، جسے سن کر ان کے تن بدن میں آگ نہ لگ جائے اور وہ مسلمانوں کو کچلنے پر تیار نہ ہو جائیں"۔ مگر اقبال مصلحت کو موت سمجھتے تھے۔ جب وہ دوسروں کو تلقین کرتے تھے :

برآور ہرچہ اندر سینہ داری

تو خود کیونکر لبوں پر قفل خاموشی لگاتے اور مسلمان کو آزادی کا درس دینے سے باز رہتے چنانچہ آپ نے بلند آواز سے کہہ دیا "مسلمانو! تمھاری سلامتی نشستوں کے تعین اور حقوق کے تحفظ کے معاہدوں میں نہیں بلکہ 'علیحدہ وطن' حاصل کرنے میں ہے۔ 'علیحدہ وطن' جو مسلمانوں کی قسمت میں لکھا جا چکا ہے جس سے انھیں کوئی

محروم نہیں رکھ سکتا۔"

مسلمانوں نے حدی خواں کی آواز کو سنا تو ان کی آنکھیں کھل گئیں اور انھوں نے کہہ دیا "آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ اب ہمیں حقوق کے تحفظ کی ضمانت درکار نہیں۔ ہم اس برِ عظیم میں اقلیت بن کر نہیں رہ سکتے اور علیحدہ وطن حاصل کر کے دم لیں گے۔" اور تاریخ گواہ ہے کہ جب مسلمانوں نے پست ہمتی اور احساسِ کمتری چھوڑا برطانوی حکومت کے جاہ و جلال اور کانگریس کی منظم طاقت سے لڑنے پر آمادہ ہو گئے تو اپنے لیے علیحدہ وطن حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہی کانگریس جو مسلمانوں کو جداگانہ حق دینے پر تیار نہ تھی اب انھیں علیحدہ وطن دینے پر راضی ہو گئی۔

قدرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ جو کوشش کرتے ہیں وہ انعام پاتے ہیں جو مستقل مزاج ہوتے ہیں وہ اپنی محنت کا ثمرہ حاصل کر کے رہتے ہیں۔ ایک مشرقی ادیب رقمطراز ہیں: "آج دنیا کے سب سے چھوٹے براعظم یورپ اور بقیہ کرۂ ارض کی ہر شاخ حیاتِ ملی میں جو عظیم الشان فرق نظر آتا ہے۔ وہ قدرت کی کسی غیر عادلانہ تقسیم کا نتیجہ نہیں۔ قدرت نہ تو بخیل ہے نہ متعصب۔ اس کے نزدیک انبیا زمرزو بوم اور تفریق رنگ و نسل کوئی شے نہیں۔ سیاہ فام افریقہ، گلفام ایران، زرد رو چین اور گندم گوں ہندوستان سب اس کے نزدیک ایک سے ہیں۔ اس کا ابرِ کرم سب پر یکساں برستا ہے۔ البتہ جو لوگ اپنے باغ و چمن کو اس سے سیراب کرتے ہیں ان کا دامن ہمیشہ گل و ثمر سے مالا مال رہتا ہے اور جن کے یہاں برسات کا موسم غفلت میں کاٹ دیا جاتا ہے ان کے یہاں ہمیشہ خاک اڑتی رہتی ہے۔" اقوام و ملل کی طرح افراد کی زندگی میں بھی یونہی انقلاب آتا ہے۔ جو لوگ برسات کے موسم میں محوِ خواب رہتے ہیں ان کے یہاں

خاک اڑتی رہتی ہے۔ اور جو اپنی کھیتی پہلے سے تیار رکھتے ہیں اُن کا دامن ہمیشہ گل وثمر سے مالا مال ہوتا ہے۔ خدا کی وسیع کائنات میں سب کو مواقع ملتے ہیں۔ اس کا ابر کرم تمام کے لیے یکساں ہے۔ جو دولت چاہتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے ہیں، مسلسل جدوجہد، انھیں دولت دی جاتی ہے اور جنھیں جاہ ومنصب کی طلب ہوتی ہے انھیں بلند رتبے دیے جاتے ہیں بشرطیکہ وہ لوہے جیسی مضبوط قوتِ ارادی کے مالک ہوں اور جدوجہد کریں۔

اس کائنات کا آقا بہت منصف مزاج ہے وہ ان لوگوں کو ضرور انعام دیتا ہے، منہ مانگا انعام دیتا ہے جو اس کے اہل ہوتے ہیں۔ وہ موچی کے لڑکے، لوہار کے بیٹے، تاجر کے فرزند اور کسان کے پوت کو قیادت کا تاج بخشتا ہے اور غریب ویتیم بچوں کو دولت مند بناتا ہے کیونکہ وہ جدوجہد کرتے ہیں۔ اپنی مساعی سے اپنے آپ کو اس انعام کا مستحق بنالیتے ہیں۔ بھولیے نہیں کہ آقائے حقیقی ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ انھیں کو دیتا ہے جو دستِ طلب دراز کرتے اور اس کے حصول کی جدوجہد کرتے ہیں اور جن کی طلب صادق ہوتی ہے۔

۳- مشکلات کا مقابلہ

مار کھم راوی ہے کہ جب ہندوستان پر اکبر حکمران تھا تو دور دیس کے ایک شہزادے کو اس کی فتوحات اور کامیابیوں کے تذکرے سن کر اس سے فتح کا راز دریافت کرنے کا شوق چرّایا۔ راہ کٹھن تھی اور سفر دور دراز مگر شہزادے کا دل امنگوں سے معمور تھا اور اس کی پیشانی طالبِ صادق کے نور سے منوّر۔ وہ سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا ہوا شہنشاہ کے دربار میں پہنچا اور شہنشاہ اکبر کے نیاز حاصل کرتے ہی دریافت کیا:

"شہنشاہ معظم! آپ کی فتوحات، کا راز کیا ہے؟ میں صرف یہ راز معلوم کرنے کو اتنی دور سے چل کر آیا ہوں"

"میری فتوحات کا راز؟" اکبر نے شہزادے کو پاس بٹھاتے اور مسکراتے ہوئے کہا "جان جوکھوں میں ڈالنے اور مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے ہی میں میری فتح کا راز مضمر ہے۔"

مشکلات کا مقابلہ شاید اکبر کی گھٹی میں داخل تھا۔ اس پر تیرہ ہی برس کی عمر میں سلطنت کی ذمہ داریوں کا بار آپڑا تھا جسے اس نے مردانہ وار برداشت کیا۔ شہنشاہ ہمایوں کے آنکھیں بند ہوتے ہی ہیمو بقال نے دہلی کے تخت پر قبضہ کر لیا اور ہندوستان کے حکمران ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نے فوراً بہت

بڑی فوج تیار کر لی تاکہ اگر کوئی تخت کا دعوے دار بنے اور دہلی پر حملہ کرے تو اسے منہ توڑ جواب دے سکے۔ جب اکبر کو ہیمو بقال کے عزائم اور تیاریوں کا علم ہوا تو اس نے سرداروں کو بلایا اور ان سے دریافت کیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ بیرم خاں کے سوا سب سرداروں نے بالاتفاق آبائی وطن میں واپس چلنے کا مشورہ دیا۔ وہ کہنے لگے کہ ہمارے پاس فوج ہے نہ اسلحہ اور دشمن کے پاس لشکرِ جرار موجود ہے۔ ہم اس قابل نہیں کہ دہلی پر حملہ کر کے ہیمو سے تخت چھین سکیں۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ آبائی وطن پہنچ کر تازہ دم فوج بھرتی کریں پھر ہندوستان پر حملہ آور ہوں لیکن ایک سردار نے اس رائے کی شدید مخالفت کی۔ وہ سردار بوڑھا مگر جواں ہمت بیرم خاں تھا۔ اس نے کہا کہ جس سلطنت کو باپ دادا نے جان جوکھوں میں ڈال کر اور بڑی خونریزی کے بعد حاصل کیا اسے آسانی سے دشمن کے حوالے کر دینا دانشمندی اور تیموری جرأت سے بعید ہے۔ یہ سن کر سیزدہ سالہ اکبر کی رگِ حمیّت و شجاعت پھڑک اٹھی۔ اس نے بزدل اور آرام طلب سرداروں کا مشورہ ماننے کے بجائے بوڑھے بیرم کی بات مان لی اور اس کے نتائج سے کون آگاہ نہیں ؟ اکبر نے ہیمو بقال سے آبائی تخت واپس لے لیا اور ہندوستان پر پچاس سال تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کی ۔

اگر اکبر کم ہمت سرداروں کا کہنا مان لیتا تو سلطنت مغلیہ کا پتّا اسی وقت کٹ جاتا۔ اکبر کے واپس آنے اور پھر سے حملہ آور ہونے تک ہیمو بقال کو اپنی جڑیں مضبوط کرنے کا موقع مل جاتا۔ ممکن ہے وہ ہندوستان کے ہندو راجاؤں کو یکجا کرنے میں کامیاب ہو جاتا جس سے اکبر کی کامیابی محال ہو جاتی۔ اکبر کے والد شہنشاہ ہمایوں

اسی غلطی کا ارتکاب کر چکے تھے جس کی وجہ سے انھیں پندرہ سال کے بعد ہندوستان میں آنا نصیب ہوا۔ اگر شیر شاہ سوری کو قضا مہلت دیتی یا اس کا جانشین اس کی طرح بہادر اور قابل ہوتا تو سلطنت مغلیہ کی بنیادیں نئے سرے سے رکھنے کی نوبت شاید ہی آتی۔ اس لیے اکبر نے اس اصول پر عمل کیا جو زندگی اور کامیابی کا ضامن ہے:

بہ کیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بہ کعبہ نہ کردم کہ راہ بے خطر است

اس کی حمیت نے ناکام ہوکر، نامراد بن کر آبائی وطن میں داخل ہونا گوارا نہ کیا اور اس کا ثمرہ حاصل کر کے رہا۔

اورنگ زیب عالمگیر کی فطرت بھی جفا طلب تھی۔ وہ جب دیکھتا تھا کہ مغل تن آسانی کے مرض میں مبتلا ہیں تو کڑھتا۔ اس نے سب کی مخالفت مول لے کر انھیں سدھارنا چاہا۔ سادگی اور جفا طلبی کو شعار بنا کر انھیں راہِ راست پر لانا چاہا۔ وہ تنہا مخالف طاقتوں سے نبرد آزما رہا اور دکن تک کے معرکوں میں بنفسِ نفیس شامل ہوتا رہا۔ مگر مغلوں کا خون زہرِ عیش سے اس حد تک مسموم ہو چکا تھا کہ کوئی تریاق حیات بخش ثابت نہ ہوسکا۔ تاہم جہاں تک اورنگ زیب کی جرأت اور پامردی کا تعلق ہے۔ وہ مجاہد کسی مشکل کو کبھی خاطر میں نہ لایا اور اپنے نصب العین کے حصول کی خاطر کڑیاں جھیلتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ جب شاہجہاں کے بیٹوں میں تخت حاصل کرنے کی کشمکش شروع ہوئی تو اورنگ زیب نے عدیم النظیر جرأت سے کام لے کر سامو گڑھ کا معرکہ جیتا تھا۔ سامو گڑھ میں مقابلہ دارا شکوہ اور اورنگ زیب کے مابین تھا۔

دارا شکوہ کے پاس اورنگ زیب سے زیادہ فوج تھی۔ اگر اورنگ زیب عالمگیر جرأت کا نمونہ اپنی سپاہ کے روبرو پیش نہ کرتا تو وہ شاید ہی دارا شکوہ کی فوج کے سامنے ٹھہر سکتی لیکن شہزادہ اورنگ زیب نے اپنے ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی تاکہ وہ بھاگ نہ سکے۔ یہ دیکھ کر اس کی فوج کے حوصلے بلند ہو گئے اور اس نے دشمن کو مار بھگایا۔

اگر آپ زندگی کے میدان سے اپنے حریفوں کو بھگانا چاہتے ہیں۔ عزت و اقبال کی مسند پر بیٹھنے کے خواہاں ہیں تو ہمت بلند رکھیے۔ مشکلات سے نہ گھبرائیے۔ افلاس، یتیمی، بے کسی اور مصائب اگر ہیلیں اولوالعزم نوجوانوں کا راستہ نہ روک سکے تو آپ کے سد راہ کیوں ہوں گے؟ اگر مشکلات اور رکاوٹیں ان کی منزل کھوٹی نہ کر سکیں تو آپ کے عزم صمیم کے سامنے کب ٹھہر سکیں گی؟

جن لوگوں نے نوعِ انسان کی بہتری کے کام کیے وہ آفات کو کبھی خاطر میں نہ لائے۔ سر راس ملیریا کے مچھروں کی تحقیقات کے لیے برسوں گرم استوائی علاقے میں چکر لگاتے رہے۔ فلورنس نائٹ انگیل نے خطرات کی پروانہ کی اور زخمیوں کی خدمت کے لیے آمادہ ہو گئی۔ نیکی کی تبلیغ کے لیے خدا کے اکثر بندوں نے اذیتیں برداشت کیں۔ قطبین کی دریافت کے لیے جو مہمیں گئیں انھیں ناقابلِ برداشت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ماؤنٹ ایورسٹ کی بلندی معلوم کرنے والی مہموں کے روزنامچے کیا ہیں؟ دکھ، تکلیف اور قدم قدم پر رکاوٹوں کی طویل داستانیں۔ غرض ان لوگوں کو جنھوں نے نسلِ انسانی کی خدمت کا بیڑا اٹھایا تکلیفیں سہنی پڑیں مگر وہ آخر دم تک اپنا نصب العین حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بعض کو تو اس کوشش میں

جامِ فنا نوش کرنا پڑا۔ اگر انسانیت کے بہی خواہ مشکلات سے ڈر جاتے تو آج ہماری دُنیا
اتنی خوبصورت نہ ہوتی اور ہماری آسائش کے جو اسباب مُہیا ہیں ہم ان سے محروم
ہو جاتے۔ پھر کیا ہمارا فرض نہیں کہ ہم بھی جدوجہد جاری رکھیں؟ یہ جدوجہد کیا ہے؟
مشکلات کا مقابلہ کیے بغیر انسان کی بہتری کے وسائل دریافت کرنا، وباؤں اور بیماریوں
پر قابو پانے کی ترکیب معلوم کرنا، نوعِ انسان کو امن و سلامتی کی راہ دکھانے کے لیے
امن کے اصولوں کا پرچار اور غلط فہمیوں کی تاریک گھٹاؤں کو دُور کرنا۔ یہ کام دشوار
ضرور ہے لیکن دشواریوں کا مقابلہ کیے بغیر انسانیت کی سربلندی بھی تو ممکن نہیں
دنیا نے اب تک جو ترقی کی ہے وہ نشانِ منزل ضرور ہے مگر منزل نہیں۔ کیا دُنیا
میں امن قائم ہو چکا ہے؟ طاقتور اقوام کو جوع الارض کے عارضے سے شفا
نصیب ہو چکی ہے؟ کیا وبائیں، مہلک بیماریاں ختم ہو گئی ہیں؟ موت پر فتح حاصل
کر لی گئی ہے؟ نہیں تو پھر کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ منزل ابھی دُور ہے اور ہمیں اس
کائنات کو دارالامان بنانے کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے۔
جب ہم اپنے حصے کا فرض ادا کرنے پر تیار رہتے جائیں اور راہ میں جو رکاوٹیں
پیش آئیں انھیں راستے سے ہٹائے بغیر دم نہ لیں۔

اس بات کی پروا نہ کیجیے کہ رات تیرہ و تار ہے اور منزل دور۔ آپ کا نصب العین
بہت بلند ہے اور ذرائع محدود۔ آپ سب سے جونیر ہیں اور ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ کر
ادارے کا منیجر، کسی ریاست کا وزیر، کسی محکمے کا انچارج بننا مشکل ہے۔ کام کیے
جائیے۔ ترقی کی طرف مائل رہیے۔ اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر بنائیے۔ اپنے
دل و دماغ کو کام میں لگا دیجیے۔ پھر ناممکن ہے کہ آپ بامِ عروج تک نہ پہنچ سکیں

اگر آپ ان افسروں کی فہرست مرتّب کریں جو اس وقت اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ پھر ایک ایک سے دریافت کریں کہ انھوں نے زندگی کے سفر کا آغاز کیونکر کیا؟ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں سے اکثر متوسط اور نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی نکل آئیں گے جو جونئر کلرک، چپراسی اور دفتری بھرتی ہوئے ہوں گے۔ ان سے دریافت کیجیے ان کی ترقی کا بھید کیا ہے؟ تو سب یہی کہیں گے کہ انھوں نے محنت کی مشکلات کا مقابلہ کیا اور گرتے پڑتے اس منزل تک پہنچے۔ پاکستان میں بڑے بڑے تاجر اور کارخانہ دار کم ہیں۔ اُن میں سے اُن لوگوں کو چھوڑ دیجیے جنھیں تقسیمِ ملک کی وجہ سے بڑے بڑے کارخانے اور کاروبار مل گئے ہیں۔ وہ جن کے والدین ان کے لیے کاروبار، جائداد اور زمینداری چھوڑ مرے ہیں۔ انھیں بھی نظر انداز کر دیجیے۔ باقی تاجروں اور کارخانہ داروں سے اگر ملاقات کا موقع ملے تو ان سے ان کی سرگزشت سنیئے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ انھیں ترقی کی موجودہ منزل تک پہنچنے کے لیے بڑی جدوجہد کرنا پڑی۔

گزشتہ سال مجھے پاکستان کے ایک مشہور کارخانہ دار سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان کی دولت سے متعلق عجیب و غریب قصے مشہور رہیں۔ ملاقات بڑی مختصر تھی اس لیے میں ان سے یہ دریافت تو نہ کر سکا آیا یہ دولت اُنھیں ورثے میں ملی ہے یا ان کی خود پیدا کردہ ہے؟ لیکن انھوں نے اپنی زندگی کے سرسری حالات جو سُنائے تو میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ دولت ان کی اپنی محنت کا ثمرہ ہے۔ وہ پنجاب کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والد کے ساتھ کابل گئے۔ سالہا سال تک روس، ترکستان اور چین کے سرحدی علاقوں میں تجارت کرتے رہے۔ سرحدوں کو عبور

کرتے وقت کئی بار مشکلات میں گرفتار ہوئے۔ کئی بار اپنی پونجی لٹا بیٹھے مگر سالہا سال کی محنت اکارت نہ گئی۔ اس وقت وہ پاکستان کے چند چوٹی کے سرمایہ داروں میں سے ہیں۔

اب میں ایک ایسے نوجوان کی جدوجہد کی کہانی سناتا ہوں جس نے میری آنکھوں کے سامنے اپنی حالت بہتر بنائی۔ وہ ایک "معین" کا لڑکا ہے۔ اس کے والدین بے حد غریب تھے۔ وہ اسے ورنیکلر مڈل سے زیادہ تعلیم نہ دلا سکے۔ اس کے باپ کی مرضی تھی کہ وہ کہیں ملازمت کرے تاکہ ان کی کچھ مالی امداد ہو سکے مگر لڑکے کی خواہش تھی کہ سلسلۂ تعلیم جاری رکھے۔ اس نے باپ سے درخواست کی کہ وہ تعلیم کا خرچ اُن سے طلب نہ کرے گا۔ اپنے تعلیمی اخراجات کے لیے محنت و مشقت کر کے خود کمائے گا بشرطیکہ اسے پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ اس کا باپ اس پر راضی ہو گیا۔ آج وہ نوجوان جس کے والدین دو وقت کی روٹی کے محتاج تھے گریجویٹ اور ایک سرکاری دفتر میں معقول مشاہرے پر ملازم ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ترقی کرے گا کیونکہ محنت اس کی گھٹی میں داخل ہے۔ بھلا جس نوجوان نے چھ سال تک دوسروں کے بچوں کو پڑھا کر اپنی تعلیم کا خرچ پورا کیا ہو وہ محنت سے کیوں جی چرانے لگا۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ کالج سے واپس آتا تھا تو رات کے نو بجے تک یکے بعد دیگرے کئی بچوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ اس کے بعد اپنے اسباق کی تیاری کیا کرتا تھا۔ اس قسم کے نوجوان بہرحال کامیاب ہو کر رہتے ہیں۔

بہت سے لوگ محض اس لیے جدوجہد کرنے سے کتراتے ہیں کہ کامیابی سالہا سال کی محنت کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ ان کے والدین انھیں بُری بھلی تعلیم دلاتے ہیں۔ وہ جوان ہونے پر کہیں ملازم ہو جاتے ہیں۔ انھیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ کام

مرضی کا ہے یا نہیں اور اس میں ترقی کا امکان ہے یا نہیں۔ وہ ایک سال تک محنت کرتے ہیں تاکہ مستقل بنا دیے جائیں۔ اس کے بعد محنت اور کوشش کی ضرورت محسوس نہیں کرتے بلکہ لکیر کے فقیر بن کر ملازمت کی میعاد پوری کر دیتے ہیں۔ وقت مقررہ پر دفتر جاتے ہیں۔ معمول کے مطابق کام کرتے ہیں۔ دفتر سے واپس آ کر شطرنج اور چوسر کی بازی ہوتی ہے۔ کبھی کبھار مشاعرے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ سیاسی مسائل پر طبع آزمائی کرتے ہیں اور بس۔ آپ انھیں کہیے "زندگی سکون کا نام نہیں۔ وہ حرکت سے عبارت ہے۔ جو لوگ محنت کرتے ہیں وہ انعام پاتے ہیں۔ آپ بھی حرکت کیجیے۔ 'حسب معمول' کو چھوڑیے۔ اپنے کام میں دلچسپی لیجیے۔ جدت پسندی کا ثبوت دیجیے" تو جواب دیں گے "دیکھیے اپنا فلسفہ اپنے پاس :

موت کا ایک دن معین ہے

جب ہمارا انجام فنا ہے تو پھر جینے کی جو فرصت ملی ہے اسے محنت و مشقت میں کیوں صرف کریں؟ آپ ہمیں لکھ دیجیے کہ محنت کا پھل کھانے تک جئیں گے اور ہم ثمرہ بہر حال حاصل کر سکیں گے تو ہم آج ہی کام سے دل لگاؤ پیدا کرتے ہیں اگر آپ اس بات کی ضمانت دینے کو تیار نہیں تو پھر اس اصول پر کیوں عمل نہ کریں :

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"

اس نظریے کے پرستار یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اگر ہمارے بزرگ اسی نظریے کے پیرو ہوتے تو پھر کیا ہوتا؟ ہم ابھی تک سردی، بارش، طوفان اور جنگلی درندوں کے ڈر سے غاروں میں پناہ لیتے۔ بیمار پڑتے تو طبی امداد میسر نہ آ سکتی، چقماق سے آگ سلگاتے اور بجلی کی روشنی سے محروم رہتے۔ اب دنوں کا سفر گھنٹوں میں طے کر رہے

ہیں، یہ سہولت بھی نہ حاصل ہوتی۔ جب ہم بزرگوں کی محنت و مشقت سے فیض یاب ہو رہے ہیں، تو پھر کیا ہمارا فرض نہیں کہ آنے والی نسلوں کی سہولت کے لیے اپنے حصے کا کام انجام دیں؟

اگر تضیع اوقات سے آپ کی زندگی میں دو چار سال کا اضافہ ہو سکتا۔ آپ کو حقیقی مسرت حاصل ہو سکتی۔ آپ فی الواقع عیش کر سکتے تو میں آپ کو مصروفِ عمل ہونے اور محنت کرنے کا مشورہ نہ دیتا۔ مگر تساہل پسندی اور کاہلی سے عمر دراز ہوتی ہے؟ خوشی حاصل ہو سکتی ہے؟ آپ کسی کاہل انسان کو دیکھیے۔ اس کے چہرے پہ نحوست برستی نظر آئے گی۔ ڈ قسم قسم کے عارضوں میں مبتلا ہوگا اور زندگی سے بیزار دکھائی دے گا۔

آپ اس بات کی ضمانت چاہتے ہیں کہ آپ محنت کا ثمر حاصل کرنے سے پہلے موت کا ذائقہ نہ چکھیں گے۔ یہ ضمانت فی الواقع کوئی نہیں دے سکتا۔ لیکن یہ بھی تو بتائیے۔ آپ کو یہ کیونکر معلوم ہوا کہ محنت کا ثمر حاصل کرنے سے پہلے ہی آپ کو رختِ سفر باندھنے پر مجبور کر دیا جائے گا؟ علاوہ بریں یہ استغنا ملازمت حاصل کرتے وقت کیوں جائز نہ سمجھا؟ سال بھر کیوں محنت کرتے رہے؟ جب آپ کو کل تک جینے کا بھروسا نہیں تو ملازمت کا بکھیڑا کیوں مول لیا؟ آپ شطرنج کیوں کھیلتے ہیں؟ تفریح کی غرض سے؟ مگر آپ کے چہرے پر تفکر کے آثار ہیں۔ آپ سوگوار نظر آتے ہیں۔ آپ کی آنکھیں بوجھل ہیں۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ آپ کے حریف کا پلہ بھاری ہے۔ وہ آپ کو مات دینا ہی چاہتا ہے۔ آپ کو ہارنے کی فکر نے پریشان کر رکھا ہے۔ اگر آپ نقلی او ہنگامی ہار سے اتنا ڈرتے ہیں۔ وہ شکست جس کا آپ کو یا آپ کی اولاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اس سے اتنا گھبراتے ہیں اور اس سے بچنے کے لیے دماغی قوت صرف کر رہے ہیں تو پھر زندگی کے

میدان میں کیوں آسانی سے ہار ماننے پر تیار رہیں ؟ کیا یہ اپنے آپ اور اپنی اولاد سے بے انصافی نہیں ؟ کیا آپ اس معاشرے کے جس کے آپ بھی رکن ہیں مجرم ہیں ؟ آپ اپنی پریشانیوں کا علاج شطرنج اور گنجفے میں ڈھونڈتے ہیں مگر سکون کے بجائے پلّے پڑتی ہے پریشانی۔ پھر الفیس تفریح کیوں سمجھا جائے ؟ "عیش" کیوں کہا جائے ؟ معلوم ہوتا ہے آپ نے سکون کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہے یا پھر سکون کی تلاش میں آپ غلط سمت چل نکلے ہیں۔ اگر آپ مسرّت کی تلاش میں ہیں، راحت اور سکون چاہتے ہیں تو اپنی، اپنی اولاد اور نوعِ انسان کی بہتری کے کام کیجیے، محنت کیجیے۔ اس کے بعد آرام تو مسرّت آپ کی ہوگی۔ پرندے دانے دانے کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں تو خوش رہتے ہیں۔ اُس پرندے سے بہت زیادہ خوش جسے مشقت کے بغیر خوراک ملتی ہے۔

اگر کاہلی ذریعۂ مسرّت ہوتی تو وہ شیر جو پنجرے میں بند ہے اور جسے شکار تلاش کرنے کی فکر نہیں، قید کو آزادی پر ترجیح دیتا۔ اسے رہنے کے لیے مکان میسّر ہے۔ دونوں وقت خوراک ملتی ہے۔ یہاں اُسے دشمن کا ڈر ہے نہ کسی اور قسم کا خطرہ لیکن شیر ان سہولتوں کو پسند نہیں کرتا کیونکہ یہ سہولتیں اسے مسرّت نہیں دے سکتیں۔ وہ جنگل کی زندگی پسند کرتا ہے جو مشقت کی زندگی ہے، وہاں دشمن کا ڈر ہے، طوفان کا خطرہ ہے لیکن شیر جدوجہد اور خطرے کی زندگی کو حیات سمجھتا ہے۔ یقین نہ ہو تو شیر کے پنجرے کا دروازہ کھول کر تجربہ کیجیے۔ وہ ایک لمحے کا توقف کیے بغیر باہر نکل آئے گا۔ نعرۂ مسرّت بلند کرے گا اور جنگل کی راہ لے گا۔

شاہین سے کسی نے دریافت کیا کہ "جب ہر روز سینکڑوں جانور مرتے ہیں اور اُن کا گوشت آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے تو تُو خواہ مخواہ شکار کی تلاش میں کیوں فضائے آسمانی

میں گھنٹوں تیرتا رہتا ہے؟" اس نے جواب دیا "میری نظر میں زندگی کا دوسرا نام جھپٹنا اور پلٹنا ہے۔ مجھے گوشت سے زیادہ جھپٹ میں لطف آتا ہے۔" آپ نے شاید جھپٹ کو کبھی آزمایا ہی نہیں۔ ذرا اس کا لطف بھی اٹھائیے۔ زندگی کو بار نہ سمجھیے۔ یہ امانت ہے اس میں خیانت کر کے آپ کیونکر سکھی رہ سکتے ہیں؟ خوش رہنا ہے تو محنت کو شعار بنائیے، دفتر میں محنت، گھر میں محنت۔ محنت سے آپ دفتری زندگی میں حرارت پیدا کر سکتے ہیں اور اسے دلچسپ بھی بنا سکتے ہیں۔ کس طرح؟ یوں کہ برسوں سے جو طریقِ کار مروج ہے اسے بدل ڈالیے۔ یہ تبدیلی بہت خوش آئند ثابت ہوگی اور نفع بخش بھی کیونکہ آپ محنت کریں گے۔ دفتر کی اصلاح کریں گے۔ جدّت سے کام لے کر اپنے ساتھیوں سے زیادہ کام لے سکیں گے اور ادارے پر ثابت کر دیں گے کہ آپ ادارے کے بہی خواہ ہیں تو آپ کی ترقی یقینی ہے اور جب دفتر سے واپس آئیے تو کچھ دیر تک بچّوں سے کھیلیے اور کھیل کھیل میں انھیں مفید باتیں بتائیے۔ چھوٹی بچّی کو حساب کا سوال حل کرنے میں مدد دیجیے۔ صحن میں چھوٹا سا باغیچہ لگانے کے لیے زمین تیار کیجیے۔ اپنی شریکِ حیات کی باتیں سنیے۔ اسے خانہ داری میں کوئی الجھن پیش آتی ہے وہ آپ کی مدد طلب کرتی ہے تو اس کی امداد کیجیے۔ ایک آدھ گھنٹہ دوستوں میں گزاریے۔ کوئی مفید مشغلہ اختیار کیجیے۔ میں شطرنج اور چوسر سے منع نہیں کرتا۔ ایک آدھ بازی میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن ادھر دیکھیے۔ سورج غروب ہو رہا ہے۔ آفتاب کی سنہری کرنیں پھولوں سے کھیل رہی ہیں۔ پرندے چہچہا رہے ہیں۔ ایسے میں گھر بیٹھنا مناسب نہیں۔ اُٹھیے اور شہر سے باہر نکل جائیے۔ کھیتوں کی ہریاول آنکھوں کو طراوت بخشتی ہے۔ اگر شہر سے باہر جانے کی ہمت نہیں تو باغ جناح کے چکر کاٹیے۔ خوبصورت روشوں پر ٹہلیے۔ پھولوں کا حُسن دیکھیے۔ تازہ ہوا

کھائیے اور رات کو سونے سے پہلے بڑے لوگوں کی صحبت میں وقت گزاریے یعنی مطالعے کی عادت ڈالیے اور اچھی کتابیں پڑھیے۔ کتابیں بہترین رفیق ہی نہیں خضر راہ بھی ہیں۔ ملٹن کے قول کے مطابق کتابیں زندگی ہیں۔ مشاہیر کے سوانح حیات، تاریخ عالم، سیر و سیاحت پر اچھی سے اچھی کتابیں موجود ہیں، ان کا مطالعہ کیجیے۔ ان لوگوں کے سوانح حیات کا مطالعہ خاص طور پر کیجیے جنھوں نے اپنی زندگی خود بنائی ہے۔ ان کتب کا مطالعہ بھی مفید ہوگا جو جد و جہد کرنے پر مستعد کرتی ہیں اور نفسی کتب کا مطالعہ آپ کو ترقی میں مدد دے گا۔ انصاف سے کہیے یہ لائحہ عمل بہتر ہے یا آپ کا موجودہ لائحہ عمل جو زندگی اور مسرت سے یکسر محروم ہے؟ آپ اصولاً میری رائے سے اتفاق کرتے ہیں تو اس پر عمل بھی کر دیکھیے۔ یقین جانیے اس سے آپ کی زندگی پر بڑا خوشگوار اثر پڑے گا اور آپ کا مستقبل درخشاں ہو سکے گا۔

محبّت فاتح عالم

۱۔ دوست بنائیے

کیا آپ کسی انسان کو جانتے ہیں جسے کبھی دوسروں کی ہمدردی کی ضرورت محسوس نہ ہوئی ہو جس نے دوسروں کے تعاون کے بغیر اپنے کاروبار کو وسعت دی ہو یا دوسروں کو اپنا بنائے بغیر قیادت کی بلندیوں تک پہنچا ہو؟ نہیں یہ ممکن نہیں۔ انسان کا خمیر اخوت، مودّت اور ہمدردی سے اٹھایا گیا ہے۔ وہ ہر گام پر دوسروں کی اعانت، ہمدردی اور تعاون کا محتاج ہے۔ امیر ہو یا غریب، کاروباری ہو یا مزدور، ماتحت ہو یا افسر، وہ تنہا اپنا کام انجام دے سکتا ہے نہ زندگی آرام سے بسر کر سکتا ہے۔ غریب امیر کے کارخانے میں کام کرتا ہے اور اس کے کاروبار کو فروغ دیتا ہے تو مشاہرہ پاتا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں۔ نپولین دُنیا کا عظیم فاتح ہو گزرا ہے۔ وہ اپنے آپ کو لاکھوں پر بھاری سمجھتا تھا۔ کیا وہ ملکوں کو تنہا فتح کیا کرتا تھا؟ نہیں۔ اس کی ساری قوت وہ سپاہی اور افسر تھے جو اس کے اشارے پر جان لڑایا کرتے تھے۔ نپولین جب کسی مہم پر روانہ ہوتا تو سپاہیوں اور کسانوں کے نمائندوں سے گلے ملتا۔ وہ کہا کرتا تھا۔ یہی لوگ میری قوت ہیں۔ قائدِ اعظم نے برطانیہ اور کانگریس سے پاکستان اپنی قوت بازو سے چھینا؟ ہرگز نہیں۔ قائدِ اعظم کی طاقت مسلم عوام تھے جو اُن کے ارشاد کو سر

آنکھوں پر رکھتے تھے۔ جب قائدِ اعظم نے برطانیہ اور انڈین نیشنل کانگرس کے سامنے مطالبۂ پاکستان پیش کیا تو انھوں نے کہہ دیا تھا کہ اس کا فیصلہ مسلم عوام کریں گے۔ اگر مسلمانوں نے انتخابات میں مسلم لیگ کا ساتھ دیا تو ہم سمجھیں گے کہ وہ پاکستان چاہتے ہیں پھر یہ مطالبہ مان لیا جائے گا۔ قائدِ اعظم کامیاب ہوئے تو اس لیے کہ ملت نے اُن کا ساتھ دیا۔

فولاد کا بادشاہ اینڈریو کارنیگی ارب پتی کیونکر بنا؟ دوسروں کی امداد و تعاون سے۔ اور وہ اسی بات پر فخر کیا کرتا تھا کہ وہ دوسروں کا تعاون حاصل کرنے کا گُر جانتا ہے۔ اس کے سنگِ مزار پر جو کتبہ لکھا ہے وہ ہمیں دوسروں کو اپنا بنانے کی تلقین کرتا ہے، "یہاں وہ آدمی محوِ خواب ہے جو اپنے سے زیادہ قابل آدمیوں سے کام لینا جانتا تھا"۔ یہ عبارت ہے اُس کتبے کی۔ کارنیگی دوسروں سے کام لینے کی استعداد پر کیوں فخر کرتا ہے؟ اس لیے کہ وہ جانتا ہے یہی استعداد ترقی کا وسیلہ ہے۔

اگر آپ کامیابی کے متمنی ہیں تو اینڈریو کارنیگی کی طرح دوسروں کا تعاون حاصل کرنا سیکھیے۔ دوسروں کو دوست بنائیے۔ دل بدست آور . . . . کے زرین مقولے پر عمل کیجیے۔ اگر آپ کسی کا دل دُکھانے سے گریز نہیں کرتے۔ کسی کا ہاتھ بٹانا گناہ سمجھتے ہیں۔ کوئی آپ سے امداد چاہے تو اسے روکھا جواب دے دیتے ہیں۔ اپنی مایا پر سانپ بن کر بیٹھے ہیں۔ آپ نے ہمدردی اور محبت کے الفاظ کا استعمال ممنوع قرار دے رکھا ہے۔ آپ کو کسی کے زخم پر مرہم کا پھاہا رکھنے کی سعادت کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ دوسروں کو اپنا نہیں بنا سکتے تو پھر سمجھ لیجیے آپ کا کامیاب ہونا دشوار ہے۔ آپ اچھے کاروباری بن سکتے ہیں نہ اچھے منصرم اور

لیڈر بننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ دور جمہوریت کا ہے۔ اس دور میں متموّل ترین
انسان کو حق رائے دہندگی حاصل ہے تو غریب مزدور کو بھی۔ آپ اسمبلی کا رکن بننا چاہتے
ہیں تو آپ کو ووٹ خریدنے ہوں گے۔ زر وسیم سے نہیں بلکہ محبت اور ہمدردی کا معاوضہ
ادا کر کے۔ وہ دن گئے جب کرنسی نوٹ ووٹ خرید سکتے تھے۔ اب اس کا امکان کم ہے۔
اگر ایسا ہونا ممکن ہوتا تو برطانیہ کا وزیر کوئی لارڈ یا سرمایہ دار ہوتا۔ امریکہ کی صدارت
ٹرومین کے حصّے میں نہ آتی بلکہ مسندِ صدارت پر کوئی ارب پتی براجمان ہوتا۔ اس لیے
اگر آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کے ہمدرد بنیں، آپ کے خیر خواہ ہوں تو پہلے خود
ہمدردی اور دوستی کا مظاہرہ کیجیے۔

کارنیگی وہ بنتے ہیں جو دوسروں سے کام لینا جانتے ہوں۔ راک فیلر بننے کی سعادت
انھیں کو نصیب ہوتی ہے جو دوسروں کو دولت کے بجائے محبت سے جیتتے ہیں۔ چارلس
شوییب اگرچہ ایک کارپوریشن کا ملازم تھا مگر اس کی آمدنی کئی کارخانہ داروں سے
زیادہ تھی۔ اس کی سالانہ تنخواہ تینتیس لاکھ روپے کے قریب تھی۔ دس ہزار روپے
روزانہ سے بھی کسی قدر زیادہ۔ اسے گراں قدر مشاہرہ کیوں دیا جاتا تھا؟ کیا اس لیے
کہ وہ دنیا کا بہترین انجینئر تھا؟ نہیں تو۔ کیا وہ بہترین اکاؤنٹنٹ تھا؟ ہرگز نہیں۔
پھر شوییب کے کس جوہر کی اتنی زیادہ قیمت ادا کی جاتی تھی؟ ڈیل کارنیگی نے ایک بار
چارلس شوییب سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اس راز کو بے نقاب کرے تو اس نے بتایا
کہ وہ مشینوں کے بجائے انسانوں سے کام لینا جانتا ہے۔ چارلس شوییب کا جواب
اس کے اپنے الفاظ میں سُنیے "میں لوگوں میں کام کرنے کے لیے جوش پیدا کرتا ہوں
اور ان کی حوصلہ افزائی کر کے ان کی قابلیت سے پُورا فائدہ اٹھاتا ہوں۔ مجھے علم

ہے کہ ماتحتوں کے کام پر نکتہ چینی کی جائے تو ان کی تخلیقی روح مرجاتی ہے اور اُن میں کام کو بطور احسن کرنے کا جو ملکہ ہوتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے اس لیے میں اُن پر کبھی نکتہ چینی نہیں کرتا۔ ان کی اغلاط پر کبھی اُن کا مضحکہ نہیں اُڑاتا۔ ہاں جس کا کام اچھا ہو اُس کی تعریف دل کھول کر ضرور کرتا ہوں۔" یہ ہے وہ قابلیت جس نے شوبؔ کی خدمات کو اتنا قیمتی بنا دیا۔ آپ اگر گراں قدر مشاہرہ حاصل کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں تو چارلس شوبؔ بنیے۔ چارلس کی طرح انسانوں سے کام لینا سیکھیے۔ چارلس کی طرح ان کا دل مٹھی میں لینے کی قابلیت پیدا کیجیے۔ نکتہ چینی کی عادت ترک کیجیے۔ دوڑتے گھوڑے کو چابک نہ ماریے۔ ماتحتوں سے کام ضرور لیجیے مگر جہاں نرمی سے کام نکل سکتا ہے وہاں محض اختیار کی نمائش واجب نہیں۔ ان پر تھوڑی سی مہربانی کر دیکھیے۔ وہ آپ کے گرویدہ بن جائیں گے۔

جو لوگ دوست اور معاون بنانے کی اہلیت نہیں رکھتے وہ کامیاب نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کی ترقی جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ ان سے ہمدردی کی ضرورت ہی محسوس نہ کریں گے۔ ساتھی اُن کی بہتری میں دلچسپی نہ لیں گے اور ماتحت ترقی میں سدِ راہ بنیں گے۔ مجھے یاد ہے ایک کمپنی کے منیجر کو ملازمت سے محض اس لیے ہاتھ دھونے پڑے کہ وہ اپنے ماتحتوں پر سختی کیا کرتا تھا۔ کبھی اس کی جھڑپ ایک کارکن سے ہوتی تھی تو کبھی دوسرے سے۔ اس کے ایک نائب کو سالانہ ترقی محض اس لیے نہ دی گئی کہ منیجر نے اس کی سفارش نہ کی تھی۔ دوسرے کو چھٹی نہ مل سکی۔ حالانکہ اس کی بیوی بسترِ مرگ پر تھی۔ اس کے اس سلوک سے تمام ماتحت نالاں تھے۔ بالآخر انھوں نے کارخانے کے مالک کو صاف کہہ دیا کہ یا تو اس منیجر کو تبدیل کیا

جائے یا ہمیں چھٹی دے دی جائے اور کارخانے کے مالک ایک آدمی کے لیے خواہ وہ مینجر ہی کیوں نہ ہو سارے عملہ کو جواب نہیں دیا کرتے اس لیے مینجر کو اپنے کیے کی سزا مل کر رہی۔

پندرہ سال ادھر کی بات ہے میں ایک صحت افزا مقام پر ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک دن صبح صبح ہی یہ خبر پھیل گئی کہ کنٹونمنٹ بورڈ کے ہیڈ کلرک کو کسی نے ہلاک کر دیا ہے۔ تحقیقات پر معلوم ہوا کہ اسے زہر دیا گیا ہے اور زہر دینے والا ایک اوورسیر ہے جسے اس ہیڈ کلرک نے تین مہینے پیشتر ملازمت سے جواب دلوایا تھا۔ ان دنوں بے روزگاری کا دور دورہ تھا۔ لوگ ملازمت کے لیے مارے مارے پھرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کسی گریجویٹ کو تیس روپے ماہانہ کی ملازمت مل جاتی تھی تو وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا تھا۔ اوورسیر کے لیے ملازمت سے علیحدگی موت کا پروانہ تھی۔ اس نے ادھر ادھر بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر ملازمت نہ ملنا تھی نہ ملی جس پر اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بے روزگار کر دینے والے ہیڈ کلرک سے انتقام لے کر رہے گا اور اس نے انجام سے بے نیاز ہو کر ہیڈ کلرک سے بدلہ لے لیا۔

دعوتِ جنگ دینے کا دستور مٹے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اس کی ضرورت کب محسوس ہوتی تھی؟ جب انسان ایک دوسرے کے جذبات کو ٹھیس لگاتا تھا اور اس کا نتیجہ بعض اوقات دونوں، کبھی کبھی دونوں میں سے ایک کی موت کی صورت میں نکلا کرتا تھا۔ امریکہ کے نامور صدر ابراہیم لنکن کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ شروع شروع میں لوگوں کے قلب وجگر کو شدید نکتہ چینی اور طنز کے نشتر چبھو کر زخمی کرنے سے ہرگز نہ ٹلتا تھا۔ لیکن ایک بار یہ نکتہ چینی وبالِ جان بن گئی اور اس شخص نے جسے

لنکن نے ہدفِ مزاح بنایا تھا دعوتِ جنگ دے دی۔ نوبت مقابلے تک پہنچی۔ اس کے بعد لنکن نے محسوس کیا کہ کسی کا دل دُکھانے کے نتائج کس قدر مہلک ثابت ہو سکتے ہیں۔

اشتعال انگیزی پر دعوتِ مبارزت دینے کا دستور تو مٹ چکا ہے لیکن یہ خیال نہ کیا جائے کہ اب انتقام کے جذبات پیدا ہی نہیں ہوتے۔ اگر آپ کے جذبات کو کوئی مجروح کرے تو کیا آپ اسے خاموشی سے برداشت کر لیں گے؟ نہیں۔ تو پھر بتائیے، آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ دوسروں کا دل دُکھائیں؟ کسی فوجی افسر نے مجھے اپنی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ سُنایا جسے میں من وعن پیش کرتا ہوں:

"میں فوج میں براہِ راست جمعدار بھرتی ہوا۔ میں عام طور پر اپنے حال میں مست رہا کرتا تھا۔ اور سینئر سردار کی بے جا خوشامد نہ کرتا تھا اس لیے صوبہ دار میجر مجھ سے ناراض رہا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے مجھے غلط راستے پر ڈال کر ذلیل کرنا چاہا مگر اتفاق سے میں بچ گیا۔ جب پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو ہماری رجمنٹ کو سمندر پار جانے کا حکم ملا۔ جہاز میں مجھ سے ایک ایسی غلطی سرزد ہو گئی۔ کہ اگر معاملہ اعلیٰ افسر تک پہنچ جاتا تو مجھے یقیناً ملازمت سے جواب مل جاتا۔ ملازمت کا تو مجھے اتنا خیال نہ تھا۔ میں تعلیم یافتہ تھا۔ ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لیے اچھی سول ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن نا اہل کہلانا مجھے پسند نہ تھا۔ اگر فوج سے نکال دیا گیا تو متعلقین کو مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا اور برادری میں بدنام ہو جاؤں گا۔ یہ خیال سوہانِ روح بنا ہوا تھا اس لیے میں نے ہر قیمت پر فوج میں رہنے کی ٹھان لی اور صوبہ دار میجر

کے پاس جاکر ان سے درخواست کی کہ وہ شفقتِ بزرگانہ سے کام لیں۔ رائی کو پہاڑ نہ بنائیں اور میری زندگی تباہ نہ کریں۔ صوبہ دار میجر پر میری منت سماجت کا اثر ہوا۔ مگر اس وقت جب میں نے آخری حربہ استعمال کیا یعنی پگڑی سر سے اتار کر اُن کے قدموں پر رکھ دی۔ معاملہ تو رفع دفع ہو گیا مگر صوبہ دار میجر کی سنگ دلی اور سرد مہری کی خلش نے مجھے ہمیشہ بے قرار رکھا۔

"میں بھی انھیں کی طرح افسر تھا۔ اگر مجھ سے غلطی سرزد ہوئی تھی تو میرا اُن سے معافی مانگنا ہی میرے لیے کافی سزا تھی۔ میں نے اُن سے گڑگڑا کر معافی مانگی مگر اُن کا دل نہ پسیجا۔ نرم ہوا تو اس وقت جب میں نے پگڑی جو عزت کی علامت ہے ان کے قدموں پر رکھ دی۔ صوبہ دار میجر نے موقع سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے مجھے بے حد ذلیل کیا۔ میں اس ذلت کا بدلہ لے کر رہوں گا۔" یہ خیال مجھ پر بھوت بن کر سوار ہو گیا۔ سمندر پار جاکر میں نے ان کے اردلی کو گانٹھا اور اسے دو سال تک اس بات کے لیے ماہانہ تنخواہ دیتا رہا کہ جب اُس صوبہ دار میجر سے کوئی غلطی سرزد ہو، وہ سرکاری مال غبن کریں یا کوئی اور خلافِ قانون حرکت کریں جس کا مجھے علم نہ ہو سکے تو وہ اردلی مجھے اطلاع دے۔ آخر وہ دن آ ہی گیا اور صوبہ دار میجر میرے جال میں پھنس گئے مگر تھے بڑے کائیاں۔ سمجھ گئے کہ میں بدلہ لے رہا ہوں اس لیے حکمت عملی سے کام لے کر مجھ سے کہنے لگے "جمعدار صاحب! آپ نے پہلے مجھ سے زبانی معافی مانگی تھی۔ پھر ہاتھ جوڑے تھے۔ بعد ازاں ہاتھ سے میرے پاؤں چھوئے تھے۔ آخر میں پگڑی میرے قدموں پر ڈال دی تھی۔ اب بتائیے کہ میں بھی ہو بہو اسی طرح کروں یا ایک دم پگڑی آپ کے قدموں پر رکھ دوں؟" بوڑھے صوبہ دار میجر کو میں نے پگڑی اپنے

قدموں پر نہ رکھنے دی اور کہا "سردار صاحب! میں آپ کو ذلیل نہیں کرنا چاہتا۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ بھی اس لیے کہ آپ یہ سبق حاصل کر سکیں کہ کسی کے جذبات کو مجروح کرنے اور اسے ذلیل کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے؟"

کارخانے کے مینیجر کو ملازمت سے کیوں ہاتھ دھونے پڑے؟ اس لیے کہ وہ اپنے ماتحتوں سے کام لینا نہ جانتا تھا۔ لنکن کو دعوتِ جنگ قبول کر کے اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالنی پڑی؟ اس لیے کہ وہ دوسروں کا مضحکہ اڑایا کرتا تھا۔ ہیڈ کلرک کو زہر کا جام کیوں نوش کرنا پڑا؟ دوسرے کو نقصان پہنچانے پر۔ اور سینئر افسر کو اپنے جونیئر کے سامنے کیوں جھکنا پڑا؟ محض اس لیے کہ اس نے دوسرے انسان کی عزت کا پاس نہ کیا۔ اس لیے اگر آپ سے کہا جائے کہ دوسروں سے کام لینا سیکھیے۔ دوسروں کے جذبات کا احترام کیجیے۔ کسی کو بلا وجہ نقصان نہ پہنچائیے اور چارلس شوئیب کی طرح کبھی اپنے ماتحت پر نکتہ چینی نہ کیجیے تو بے جا نہیں۔ اگر ہم چارلس شوئیب کی کامیابی سے سبق حاصل کرنا چاہیں تو ہمیں یہ زریں اصول مدِّ نظر رکھنا ہو گا کہ ماتحتوں پر نکتہ چینی کے بجائے اُن کا حوصلہ بڑھایا جائے۔ ساتھیوں کو اپنے خلوص کا یقین دلایا جائے تاکہ وہ ترقی میں مددگار ثابت ہوں۔

ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کے جذبات کا احترام کیا جائے، اسے ذلیل نہ سمجھا جائے۔ پنجاب کے گزشتہ انتخابات میں ہر علاقے کے "معینوں" نے اپنے ووٹ ان امیدواروں کو دیے ہیں جو ان خاندانوں سے تعلق نہ رکھتے تھے جو انھیں ذلیل سمجھتے تھے اور اپنے سامنے چارپائی پر بیٹھنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ خاندانی امیدواروں نے اوّل تو "معینوں" کے پاس جانے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی

کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ معین، ان کا حکم کیونکہ ٹال سکتے ہیں اور اگر جانتے تھے تو وہ معین، ووٹ دینے کی حامی بھر لیتے لیکن اپنے خفیہ جلسوں اور ملاقاتوں میں طے کرتے کہ خاندانی امیدوار کو ووٹ نہ دیں گے۔ وہ اصل میں انتقام لینا چاہتے تھے اس سلوک کا انتقام جو اُن سے روا رکھا جاتا تھا۔ ان 'معینوں' کی طرح مزدور، کارکن اور ماتحت اس افسر کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں جو انھیں ذلیل سمجھتا ہے اور جو افسر ان کے جذبات کا احترام کرتا ہے اس کے احکام کی تعمیل بڑی خوشی سے کرتے ہیں، ضرورت پر اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ کہتے ہیں شیشے میں بال آجائے تو جڑ سکتا ہے مگر دل میں بال آئے تو اس کا جڑنا محال ہے۔ دل کی بستی ایک بار اجڑ جائے تو اس کا بسنا سہل نہیں۔ زبان کے زخم سدا ہرے رہتے ہیں انھیں کوئی مرہم فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ جب آپ جانتے ہیں کہ انسانی فطرت کا شیشہ اتنا نازک ہے تو پھر اسے ٹھیس کیوں لگائی جائے؟

دوسروں کو دوست بنانا اور ان کا تعاون حاصل کرنا دشوار نہیں۔ ضرورت ہے تو اس بات کی کہ انسانی فطرت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ انسان کن باتوں کو پسند کرتا ہے اور کن کو ناپسند۔ اس کا اندازہ اپنی پسند و ناپسند سے کیجیے۔ "جو بات اپنے لیے پسند نہیں کرتے وہ دوسروں کے لیے بھی پسند نہ کریں"، حکیمانہ قول ہے اور تقریباً سو فی صد سچ۔ اگر آپ یہ نکتہ سمجھ لیں اور اس پر عمل پیرا ہونے کا قصد کر لیں تو دوسروں کو دوست بنانے، دوسروں سے کام لینے اور تعلقات بڑھانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

کیا آپ نہیں چاہتے کہ جب آپ کسی سے مبادلہ خیالات کریں تو مخاطب

آپ کا نقطۂ نظر سمجھنے کی کوشش کرے، جسے آپ حق سمجھتے ہیں اسے وہ بھی حق سمجھے؟ چاہتے ہیں اور ضرور چاہتے ہیں تو بس اسی طرح دوسروں کی بھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کا نقطۂ نظر صحیح سمجھا جائے۔ ان کی دلیل کو نہ جھٹلایا جائے۔ اگر آپ دوسروں پر اپنے خیالات ٹھونسنے کی کوشش کرتے وقت سوچیں کہ آپ کی طرح آپ کا ہم کلام بھی یہی چاہتا ہے تو پھر شاید آپ کو اس بات کا ذرا رنج نہ ہو کہ آپ کی بات نہیں مانی گئی۔ مناظروں نے مباحثوں سے مسائل کبھی حل نہیں ہوتے۔ مناظر گھر سے حریف کو شکست دینے کے ارادے سے نکلتے ہیں۔ پیشہ ور مناظر کبھی ہار نہیں مانتے۔ جب وہ دلیل کا جواب دلیل سے نہیں دے سکتے تو مسئلے کا کوئی دوسرا پہلو لے کر اپنا پہلو بچا لیتے ہیں۔ مناظرے میں حصہ لینے والوں میں سے کسی کو اس بات کا رتی بھر افسوس نہیں ہوتا کہ وہ مخالفین یا حاضرین کو اپنا ہم نوا نہیں بنا سکا۔ وہ یہ تو رقعے کر میدانِ مناظرہ میں جاتے ہی نہیں پھر افسوس کیوں ہو۔ دوستانہ بات چیت کو چھوٹے پیمانے پہ مناظرہ سمجھیے۔ آپ کا دوست سمجھتا ہے کہ دنیا کے لیے بہترین نظام 'جمہوریت' ہے۔ اس نے یہ نظریہ یونہی قائم نہیں کر لیا بلکہ اس کے متعلق کئی کتابوں کا مطالعہ کر چکا ہے۔ اس نے بہت سی تقریریں سنی ہیں اور سیاست دانوں سے مبادلۂ خیالات کیا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ جونہی آپ اشتراکیت کی مدح میں دو چار جملے کہیں یا ایک آدھ دلیل پیش کریں وہ آمنا وصدقنا کہہ دے تو ممکن نہیں۔ آپ کا دوست بھی آپ کی طرح دل و دماغ رکھتا ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ وہ اشتراکیت کو اچھا نظامِ حیات نہیں سمجھتا۔ آپ کے جواب میں وہ اشتراکیت کے نقائص بتلائے گا اور ثابت کرنے کی کوشش کرے گا کہ یہ نظام

غیر فطری ہے۔ آپ کی طرح اس کی خواہش بھی یہی ہو گی کہ اس کا نظریہ مان لیا جائے۔ آپ ہار مان لیں۔ پھر کیا یہ بہتر نہیں کہ آپ اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے بعد اس کا نقطۂ نظر بھی سمجھنے کی کوشش کریں اور دوستانہ بات چیت کو مناظرہ نہ بنائیں؟ مناظر اور مبلغ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مناظر ہٹ دھرم ہوتا ہے مگر مبلغ کی حیثیت مشیر کی سی ہوتی ہے۔ وہ حق پیش کرتا ہے تو دوسرے آدمی کو اسے سمجھنے کی اور قبول کرنے کی مہلت بھی دیتا ہے۔ وہ اپنے ہم کلام پر اپنا تفوق ظاہر نہیں کرنا چاہتا بلکہ دل سوزی سے سمجھاتا ہے اور اس آدمی سے ناراض نہیں ہوتا جو اس کی بات نہیں مانتا بلکہ اس سے دوستانہ روابط قائم رکھتا ہے۔

جب میں کہتا ہوں کہ دوسروں پر اپنا نقطۂ نظر ٹھونسنے کی کوشش نہ کی جائے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ حق کو چھپائیں اور راستی کی تبلیغ چھوڑ دیں۔ ہاں میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ کسی سے بات چیت کرتے وقت اس کے احساسات کا خیال رکھیے۔ اس کے جذبات کو مجروح نہ کیجیے۔ اسے سمجھائیے مگر محبت سے اور راہ پر لائیے مگر نرمی سے۔ مذاہب کی تبلیغ مناظرین نے نہیں کی مبلغین نے کی ہے اور اچھا مبلغ وہی سمجھا جاتا ہے جو نرمی اور پیار سے اپنی بات دوسروں کو سمجھاتا ہے، جو پھولوں کے ساتھ کانٹے قبول کرتا ہے یعنی ہم کلام کا غصہ بھی برداشت کرتا ہے۔ مبلغ دوسروں کی بات سنتا ہے اور اس کی تردید کرتے وقت اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ اس کی تردید کسی کے قلب کو زخمی نہ کرے۔ نہ وہ کسی پر اپنا نقطۂ نظر ٹھونستا ہے۔ خوب یاد رکھیے وہ سمجھاتا ہے ٹھونستا نہیں۔ اگر آپ کسی کو ہم خیال بنانا چاہتے ہیں، آپ کی مرضی ہے کہ آپ کا دوست یا ہمسایہ راہِ راست اختیار کرلے، آپ

بنی نوعِ انسان کو راست باز، راست شعار دیکھنا چاہتے ہیں، انھیں صراطِ مستقیم دکھا کر اپنی عاقبت سنوارنا چاہتے ہیں تو اپنا فرض ضرور ادا کیجیے لیکن مناظر بن کر نہیں بلکہ مبلغ بن کر۔ کسی کو دعوتِ حق دیتے وقت دل میں یہ خیال نہ کیجیے کہ آپ اسے شکست دے کر اپنے حلقے میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کا نصب العین دوسروں کی خدمت ہوگا تو آپ کی بات ان کے دل میں اثر کر رہے گی۔ کم از کم وہ آپ سے بدگمان نہ ہوں گے جس کا مفہوم دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ آپ کی کامیابی کا امکان ہے۔ آج نہ سہی پھر کبھی آپ انھیں راہِ راست پر لا سکتے ہیں۔

بعض لوگ شکایت کرتے ہیں کہ ان کا کوئی دوست نہیں مگر شکایت کرنے والے حضرات نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ وہ خود کس کے دوست ہیں جو لوگ دوسروں کو دوست بنانا چاہتے ہیں وہ پہلے خود ان کے دوست بنتے ہیں۔ آپ خود تو کسی کا ساتھ دینے پر تیار نہیں۔ کسی کے لیے غم کھانا ضروری نہیں سمجھتے تو پھر کسی کو کیا پڑی ہے کہ وہ اپنی راحت آپ پر قربان کرے۔ اس لیے دوستوں کی تمنا ہے۔ تو پہلے خود دوستی کی پیش کش کیجیے۔ کسی کے دُکھ درد کے ساتھی بنیے۔ کسی مجروح کے زخم پر مرہم لگائیے۔ اگر آپ کا کوئی ساتھی مالی مجبوریوں میں مبتلا ہے اور آپ اس قابل ہیں کہ اس کی تھوڑی بہت مدد کر سکیں تو اس سے دریغ نہ کیجیے۔ اور کچھ نہیں کر سکتے تو لفظی ہمدردی ہی سہی۔ اگر الفاظ دل کی گہرائیوں سے نکلیں گے تو دوسرے کو یقیناً متاثر کریں گے۔ خلوص بڑی دولت ہے۔ دوستوں سے نمائشی محبت اور ہمدردی نہ کیجیے بلکہ انھیں خلوص کا ہدیہ پیش کیجیے۔ اس کا جواب خلوص میں ملے گا۔ اگر آپ کسی کی مدد کرتے وقت ذاتی اغراض مدِ نظر رکھتے ہیں تو وہ ہمدردی

بیکار ہے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ دو آدمیوں میں کچھ عرصے تک گاڑھی چھنتی ہے۔ مگر چندے بعد وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو نوبت سرپھٹول اور مقدموں تک جا پہنچتی ہے۔ ان کی دوستی کا رشتہ ٹوٹتے دیکھ کر ہمیں افسوس ہوتا ہے۔ ہر شریف النفس اسے المیہ سمجھتا ہے اور یہ صورتِ حال ہے بھی بڑی افسوسناک لیکن اگر ہم غور کریں کہ ان میں اختلاف کیوں پیدا ہوا تو پتا چلے گا کہ :

اس دوستی کے بھیس میں بہروپیے بھی ہیں
اے دوست ہوشیار خبردار دیکھ کر

کے مصداق ان کی دوستی خود غرضی پر مبنی تھی۔ ایک نے دوسرے کو دوست کہہ کر اسے مالی نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور اگر اس سے جس پر مالی نقصان پہنچانے کا الزام عائد کیا جاتا ہے، پوچھیے تو وہ کہے گا کہ اس کا دوست آستین کا سانپ نکلا ہے۔ اس نے دوستی کے نام کو بٹا لگایا ہے اور اسے دوست کہہ کر اس کی جڑیں کاٹتا رہا ہے۔ اس کے گھر کو اُجاڑ کر اپنا گھر بسایا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے کبھی دوست نہ تھے۔ دونوں خود غرض تھے۔ انھوں نے ایک دوسرے کی جانب دوستی کا ہاتھ نیک نیتی سے نہ بڑھایا بلکہ دونوں چاہتے تھے کہ دوسرے کو اُلّو بنا کر اپنا کام نکالیں۔ ایسی دوستی دشمنی ہی پہ منتج ہوا کرتی ہے کیونکہ خود غرضی دیر تک دوستی کے لبادے میں چھپی نہیں رہ سکتی۔

بے لوث محبت اور بے غرض ہمدردی یا خدمت جادو کا اثر رکھتی ہے۔ جو لوگ دوسروں کی بے لوث خدمت اور بے غرض ہمدردی کرتے ہیں وہ انھیں بے دام غلام بنا لیتے ہیں۔ مجھے اپنے گاؤں کا ایک واقعہ یاد ہے جو بے لوث خدمت کی

افادیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ ہمارے گاؤں کا ایک نوجوان کسان بڑا خوش خُلق اور مہمان نواز تھا۔ اگر کوئی مسافر اس کی حویلی میں رات بسر کرنے کے لیے آجاتا تو اس کے دل کا کنول کھل جاتا اور وہ ناخواندہ مہمان کی اچھی طرح تواضع کرتا۔ ایک بار اس کے یہاں امین آباد کے قرب و جوار کا ایک کسان آیا۔ یہ کسان علاقہ دھنی سے بیل خرید کر لایا تھا۔ رات بسر کرنا چاہتا تھا۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ فلاں کسان کے یہاں جاؤ گے تو روٹی بھی ملے گی اور بیلوں کے لیے چارہ بھی۔ اور ہمارے گاؤں کے کسان نے نہ صرف یہ کہ اس کی اچھی خاطر مدارات کی بلکہ اس کے بیلوں کو مفت چارہ بھی دیا۔ اس واقعے کو کئی مہینے گزر گئے۔ وہ نوجوان کسان فوت ہو گیا۔ اس کے بوڑھے والدین نے زمین ٹھیکے پر دے دی اور بیل فروخت کرنے کے لیے امین آباد منڈی میں بھجوا دیئے مگر اس سال بکری کم تھی اس لیے نہ بیل فروخت نہ ہو سکے۔ ناچار وہ آدمی جو بیل فروخت .... کرنے کے لیے گیا تھا انہیں واپس لے چلا لیکن وہ حیران تھا کہ اب کیا بنے گا۔ بیلوں کے مالک کو بیلوں کی ضرورت نہیں۔ وہ زمین ٹھیکے پر دے چکا ہے۔ اس کے علاوہ جوان بیٹے کی موت نے اسے نڈھال کر رکھا ہے۔ وہ بیلوں کی نگہداشت کیونکر کرے گا۔ اتنے میں شام ہو گئی۔ اسے سڑک کے کنارے ایک کنواں نظر آیا۔ وہ حقہ پینے اور یہ دریافت کرنے کہ رات کو ٹھہرنے کی جگہ مل جائے گی یا نہیں کنوئیں پر چلا گیا۔ اس کنوئیں کا مالک وہی کسان تھا جس نے ایک رات ہمارے گاؤں میں بسر کی تھی۔ اس نے بیل پہچان لیے۔ حیران تھا کہ یہ بیل اس شخص کے ہاتھ کیونکر لگے؟ اس نے نو وارد سے حقیقتِ حال دریافت کی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ بیلوں کا آقا فوت ہو گیا ہے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر

رو دیا اور اس ہمدردی کا جو ایک بار اس سے روا رکھی گئی تھی صلہ یوں ادا کیا کہ بیلوں کی نگہداشت اور فروخت کی ذمہ داری قبول کی۔ وہ چھ مہینے تک بیلوں کی خدمت کرتا رہا۔ اس نے خود ان کا خریدار تلاش کیا اور رقم منی آرڈر کے ذریعے سے اپنے محسن کے والد کو بھیج دی۔ امین آباد کے کسان نے یہ ایثار کیوں کیا؟ اس بے لوث ہمدردی کا جواب دینے کے لیے جو آج سے کئی مہینے پیشتر ایک رات اس سے روا رکھی گئی تھی جو لوگ مخلص دوستوں کی تلاش میں ہیں انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس دُنیا کی کھیتی میں جو کچھ بویا جاتا ہے وہی کاٹا جاتا ہے۔ اگر آپ کسی سے محبت کریں گے، بے غرض محبت۔ کسی کے دُکھ درد میں شریک ہوں گے، خلوصِ نیّت سے تو آپ سے بے لوث محبت کی جائے گی۔ یہ خیال دل سے نکال دیجیے کہ آپ کی کھوٹی محبت اور دکھاوے کی دوستی کھری محبت کو اپنی طرف کھینچ سکے گی۔ یہ بیسویں صدی ہے۔ اب انسان اتنا ہوشیار ضرور ہے کہ اسے معلوم ہو جاتا ہے آپ اس کے متعلق کس قسم کے خیالات رکھتے ہیں۔

روایت ہے ابراہیم ادھم نے ایک بار خواب میں دیکھا کہ ایک فرشتہ کاغذ پر کچھ لکھ رہا ہے۔ ابراہیم نے اس سے دریافت کیا کہ وہ کیا لکھ رہا ہے۔ فرشتے نے جواب دیا کہ وہ ان لوگوں کے نام لکھ رہا ہے جو خدا سے محبت کرتے ہیں۔ ابراہیم نے پوچھا اس فہرست میں میرا نام بھی موجود ہے یا نہیں؟ فرشتے نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر ابراہیم نے درخواست کی کہ اس کا نام ان لوگوں کی فہرست میں شامل کر دیا جائے جو خدا کے بندوں سے محبت کرتے ہیں۔ نیک فرشتے نے یہ درخواست منظور کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ اگلے دن ابراہیم ادھم خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ان کا نام

ان لوگوں کی فہرست میں سب سے اوپر درج ہے جو خدا سے محبت کرتے ہیں۔ اس حکایت میں یہ سبق دیا گیا ہے کہ نوعِ انسان سے محبت کیجیے، بے لوث محبت۔ یہ نیکی ہے بہت بڑی نیکی اور خدا کے یہاں اسے قبولیّت کا شرف حاصل ہے۔ اس انسان کو جو خدا کے بندوں سے محبت کرتا ہے، خدا سے محبت کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے:

دل بدست آور کہ حجِ اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

دل کو قابو میں لانا، دوسروں کو اپنا بنانا، ان پہ لطف و کرم کی بارش کر کے انھیں ممنونِ احسان بنانا فی الواقع بڑی نیکی ہے، خود اپنے آپ سے نیکی کیونکہ دلوں کی کائنات کو مسخر کر کے آپ اپنی دنیا بنا سکتے ہیں۔

مخلص دوست اور معاون اسی وقت مل سکتے ہیں جب آپ کسی طرف دوستی کا ہاتھ خلوص سے بڑھائیں گے۔ دل کی کشش کا فلسفہ افسانہ نہیں۔ دل کو واقعی دل سے راہ ہوتی ہے۔ آپ مسلسل ایک ہفتے تک کسی ملاقاتی کے متعلق برائی کے خیالات کو دل میں جگہ دیجیے۔ ان کا اثر اس کے دل پہ ہو کر رہے گا۔ وہ محسوس کرے گا کہ آپ اس کی طرف سے بدگمان ہیں۔ آپ تپاک سے ملیں۔ ملاقات کے وقت مسکراہٹوں کے پھول برسائیں مگر تلخی جو آپ کے نہاں خانۂ دل میں موجود ہے اس پر اثر کر کے رہے گی۔ آپ اسے چھپانے کی لاکھ کوشش کرتے ہیں۔ کوئی ایسی بات زبان سے نہیں نکالتے جو اسے رنج پہنچائے۔ پھر بھی اسے معلوم ہو کر رہتا ہے کہ آپ کے دل میں میل ہے۔

دوسروں کو اپنا بنانے کے لیے ان کی دلچسپیوں میں دلچسپی لینا ازبس ضروری ہے۔
ہر وقت اپنے متعلق نہ کہتے رہیے۔ اپنی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے نہ ملائیے۔
"میں بڑا دیانت دار ہوں۔ محبِّ وطن ہوں۔ حق گو ہوں اور دار پہ بھی حق کہ سکتا ہوں۔
میرا نصب العین بلند ہے۔ میں نے ایک موقع پر اصول کی خاطر دس لاکھ روپے
ٹھکرا دیے۔" خدا کے لیے اس "میں میں" کو بند کیجیے۔ دُنیا میں آپ کے علاوہ اور لوگ
بھی بستے ہیں۔ کچھ ان کے متعلق بھی کہیے۔ کچھ ان کی سنیے "آپ" کہنا سیکھیے۔ "آپ"
میں خوبیاں ڈھونڈیے "آپ" کی تعریف کیجیے جس انسان سے آپ مخاطب ہیں۔
وہ بھی گوشت پوست کا بنا ہوا ہے۔ اگر آپ اپنی تعریف سُن کر پھولے نہیں سماتے،
خود اپنے قصیدے تصنیف فرماتے ہیں تو مخاطب بھی یہی کچھ چاہ سکتا ہے۔ اس کی
تمنّا بھی یہی ہو سکتی ہے کہ کوئی اس کے متعلق کہے۔ اس کی تعریف کرے۔ مانا کہ آپ کو
"ڈرامے" سے دلچسپی نہیں۔ آپ غزل کے رسیا ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر وقت غزل
کی باتیں کریں لیکن غور تو کیجیے، آپ کی تقریر سُن کر اس سامع کی حالت کیا ہو گی، جو
غزل سے شغف نہیں رکھتا اور ڈرامے کو پسند کرتا ہے؟ آپ نے گھنٹہ بھر تک
اس کا دماغ چاٹا ہے تو کیا حرج ہے اگر تھوڑی دیر کے لیے اس صنفِ کلام کو
جسے ڈرامہ کہتے ہیں زیرِ بحث لائیے۔ کسی اچھے ڈرامے کی تعریف کر دیجیے۔ مخاطب
سے پوچھیے کہ وہ کس ڈرامے کو پسند کرتا ہے۔ اس کے ذوق کی داد دیجیے۔ اگر وہ
خود ڈرامہ نویس ہے تو اس کے کسی ڈرامے کی تعریف کر دیجیے۔ وہ کسی ڈرامے کے
متعلق اپنے جذبات ظاہر کرنا چاہتا ہے تو اُنھیں توجہ سے سنیے تاکہ وہ محسوس
کر سکے، آپ اس کی دلچسپی سے دلچسپی لے رہے ہیں۔ بھولیے نہیں کہ ہر وقت "میں"

کی تکرار سے آپ کا مخاطب کبیدہ خاطر ہو جائے گا۔ وہ اپنے دل میں کہے گا "اس انسان سے رابطہ بڑھانا بے سود ہے جسے اپنے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا جسے دلچسپی ہے تو صرف اپنی دلچسپی سے۔" اور صیغہ متکلم کی کثرتِ استعمال کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا۔ کہ لوگ آپ کے ساتھ تعلقات بڑھانے سے کترائیں گے۔ اگر بازار میں آپ کو سامنے کی طرف سے آتا دیکھیں گے تو اُلٹے پاؤں مُڑ جائیں گے یا پہلو کی گلی میں گھُس جائیں گے۔ وہ ایک دوسرے سے کہیں گے " اب ایک قدم آگے نہ بڑھیے دوست ہما سامنے سے جناب 'میں' تشریف لا رہے ہیں۔ پتا نہیں صبح صبح کس منحوس کا منہ دیکھا تھا، ان کے اڑے چڑھ جانا بدمزگی اور کبیدگی کو دعوت دینا ہے۔ میں نے یہ کیا ہے، میں وہ کیے رہوں گا۔ اس کے سوا کچھ نہ سُنیں گے۔" مشہور ماہرِ نفسیات الفرڈ ایڈلر کہتا ہے " جو انسان دوسروں کے دُکھ درد میں شریک نہیں ہوتا، ان کے معاملات میں دلچسپی نہیں لیتا، ان کی خوشی پر مسرور نہیں ہوتا اسے زندگی میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔" ایڈلر کا کہنا صحیح ہے۔ جب آپ کسی کے جذبات کا احترام نہ کریں گے، کسی کی بہتری میں دلچسپی نہ لیں گے تو دوسروں کو کیا پڑی ہے کہ آپ کی باتیں توجہ سے سُنیں؟ آپ کے دُکھ درد میں شریک ہوں؟ آپ کی پسند کو اپنی پسند سمجھیں؟ گورڈن بائرن اور ڈیل کارنیگی دونوں کہتے ہیں " دوسروں کی نگاہ میں جچنا ہے تو ان کی دلچسپیوں کو اپنی دلچسپیاں سمجھیے نہ سمجھیے لیکن اتنا تو کیجیے کہ ان کی دلچسپیوں کو کم اہم نہ سمجھیے۔" آپ دیکھتے ہیں وہ آدمی جس سے آپ مخاطب ہیں، موسم سے نالاں ہے تو پھر موسم کے متعلق سلسلۂ گفتگو کو طوالت کیوں نہ دیں؟ مانا آپ نے بیڈمنٹن کے مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ جس انسان سے آپ

باتیں کر رہے ہیں اسے یہ بشارت سنائیں اور وہ گھنٹوں آپ کی کامیابی کی داستان سنتا رہے لیکن یہ بھی تو بتائیے کہ آپ کے مخاطب کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ اگر آپ اپنا کارنامہ بتائے بغیر نہیں رہ سکتے تو اس کی دلچسپی سے دلچسپی لیتے ہوئے بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ آپ شاکیٔ موسم کے ہم نوا ہوتے ہوئے بھی کہہ سکتے ہیں "جی ہاں! موسم واقعی خراب ہے اور اس سے آپ ہی نالاں نہیں۔ آج تو اس نے ہمیں بھی بڑا زِچ کیا۔ آج بیڈمنٹن کا میچ تھا۔ میں جیت تو گیا اور انعام حاصل کر ہی لیا مگر بڑی دقت سے۔" ایسا کرنے سے آپ اپنا مقصد بھی حاصل کر لیں گے اور اس انسان کو بھی جس سے آپ مخاطب ہیں، یہ شکایت نہ ہو گی کہ آپ کو صرف اپنی پڑی ہے۔

اگر آپ کسی کارخانے کے مالک ہیں تو کارنیگی کی طرح اپنے سے قابل آدمیوں سے کام لینا سیکھیے۔ کاروبار اور کارخانہ داری میں کامیابی صرف سرمایہ لگانے سے نہیں ہو سکتی۔ اس کا انحصار آپ کی اس استعداد پر ہے کہ آپ کارکنوں سے کام لینا جانتے ہیں یا نہیں۔ اور کام لینے کا جو طریق چارلس شواب بتاتا ہے وہی بہتر ہے اپنے ماتحتوں پر کبھی ناراض نہ ہوجیے اور ان کی حوصلہ افزائی کر کے ان کی قابلیتوں سے فائدہ اٹھائیے۔ آپ کسی دن کارخانے کے معائنے پر نکلتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ نوجوان انجینئر اپنے کام میں مصروف ہے اور نہایت دیانت داری سے اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔ اس نے ایک ایسا پرزہ تیار کر لیا ہے جو آپ کے کارخانے کی شہرت کو چار چاند لگا دے گا۔ وہ آپ کو دیکھ کر دوڑا دوڑا آتا ہے اور بڑی خوشی سے اپنا کارنامہ بتاتا ہے مگر آپ ہیں کہ اس کی کامیابی پر اسے ہدیۂ تبریک پیش کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے اس کا دل توڑ دیتے

ہیں۔" اگر یہ پُرزہ بنالیا ہے تو کیا کمال کیا ہے؟ تین سال سے مفت کی تنخواہ بھی تو مجھیں سے رہے ہو۔ جب میں فلاں کارخانے میں پہلے پہل ملازم ہوا تھا تو میں نے دہ دہ چیزیں تیار کیں کہ کارخانہ دار یاد کرتا ہوگا۔ ہُونہہ۔" یہ نشتر اس کے قلب کو مجروح کردے گا۔ اس کے دل میں فوراً یہ خیال پیدا ہوگا کہ اس کارخانے میں قابلیت کے جوہر دکھانا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔ یہاں کام کرنے کا یہی اصول اچھا ہے کہ جس قدر تنخواہ ملتی ہے اسی قدر کام کرو۔ بتایئے اس نیش زنی سے آپ کیا حاصل کرسکتے ہیں؟ یہی نا کہ ہونہار کارکن اپنی قابلیت ظاہر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کریں گے۔ پھر کیا یہ بہتر نہیں کہ آپ اس کی انگلیوں کا خون کرنے کے بجائے اس کا حوصلہ بڑھائیں۔ اس کی کامیابی پر اسے خراجِ تحسین پیش کریں اور تنخواہ میں اضافہ کرکے اس پر ظاہر کردیں کہ آپ اس کارکن کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں جو کارخانے کا بہی خواہ ہے۔ آپ کا حسنِ سلوک اس ہونہار انجینئر کو مستعد کرے گا کہ وہ ایجاد و اختراع میں دلچسپی لیتا رہے بلکہ کارخانے کے دوسرے ملازمین بھی کوئی اچھا کام کرکے آپ سے "ستائش" اور تنخواہ میں "ترقی" کا انعام حاصل کرنا چاہیں گے۔

۲- دوستوں کا انتخاب

روابط بڑھانے کے لیے خلوص اور دوسروں سے کام لینے کے لیے ہمدردی اور ان کی دلچسپیوں سے دلچسپی لینے پر اس لیے زور دیا گیا ہے کہ ہمارے یہاں ان کی اہمیت کم محسوس کی جاتی ہے۔ میں نے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے اکثر افسروں کو دیکھا ہے کہ وہ ناک بھوں چڑھانا، بات بات پر ماتحتوں کو ڈانٹ ڈپٹ کا شربت تلخ پلانا، فرعون بنے رہنا اپنا فرض گردانتے ہیں۔ انھوں نے خدا جانے کس استاد سے سبق سیکھا ہے کہ رعب قائم رکھنے کے لیے ماتحتوں کے ساتھ سختی سے پیش آنا ضروری ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ غلامی کے دور میں انھیں اس کی لت پڑی ہو۔ میں چاہتا ہوں، اب کہ ہم آزاد ہو چکے ہیں، سب ایک کل کے اجزا ہیں، سب وطن کی عزت اور ناموس کے لیے کام کر رہے ہیں اپنی عادت کی اصلاح کریں، وہ اصول کو اختیار کریں جو آزاد اقوام کے پسندیدہ ہیں۔

حلقۂ احباب کی توسیع کے لیے شاید خوش پوش ہونا ضروری نہ ہو لیکن اتنی بات نہ بھولیے کہ خوش پوش انسان سوسائٹی میں جلد جگہ حاصل کرتا ہے۔ جو لوگ محفل اور لباس کے آداب ملحوظ نہیں رکھتے۔ انھیں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ صاف ستھرا لباس انسان کا زیور ہے۔ آپ کی باطنی خوبیاں اس وقت ظاہر ہوتی ہیں، جب آپ دوستوں سے ملتے وقت بات چیت کرتے ہیں، اُن پر اپنی قابلیت کا سکہ

بٹھاتے ہیں مگر پہلا تاثر لباس کا ہوتا ہے وہ آپ کو میلے کپڑے پہنے دیکھیں گے
تو ان کی طبیعت مکدّر ہو جائے گی اور اس تکدّر کو آپ کی خوش کلامی بھی شاید ہی دُور
کر سکے۔ لباس صاف ستھرا ہو تو نہ صرف یہ کہ محفلِ احباب میں مناسب جگہ ملتی ہے
بلکہ روز مرّہ کی زندگی میں بھی بڑی آسانیاں ہوتی ہیں۔ ریل کا سفر ہو یا کسی تقریب میں
شمولیت کا موقع، ہر جگہ اچھا لباس عزت کا باعث بنتا ہے۔ یہ روایت تو آپ نے
ضرور سُنی ہو گی، کسی شاہی تقریب میں ایک معزّز انسان کو محض اس وجہ سے
شمولیت کی اجازت نہ دی گئی کہ اس کے لباس سے یہ ظاہر نہ ہوتا تھا، وہ معزّز
ہے اور جب وہی فرد لباس تبدیل کر کے آیا تو پہرے داروں نے اتنا بھی نہ پوچھا
کہ اسے دعوت نامہ بھیجا گیا یا نہیں۔ اس روایت کی تصدیق تقریباً ہر تقریب
اور جلسے میں آج بھی ہوتی ہے۔ اگر آپ کا لباس اچھا ہے تو بارہا داخلے کا ٹکٹ
پوچھنے کی نوبت نہیں آتی۔

خوش پوش ہونے سے یہ مراد نہیں کہ آپ کا لباس بڑھیا اور ریشمی ہو۔ ہاں
یہ ضروری ہے کہ صاف ستھرا ہو۔ زمانے اور موسم سے مناسبت رکھتا ہو۔ زمانے
سے مناسبت پر ناک بھوں نہ چڑھایئے۔ آخر آپ کو نظم و نسق سے کیوں چڑ ہے؟
آپ صفائی کا نام لینے پر تلملاتے کیوں ہیں؟ میں تو سیدھی سی بات کہتا ہوں کہ لباس
خواہ کھدر کا ہو لیکن ہو دُھلا ہُوا تا کہ آپ کسی کی خاطر پر بار نہ بنیں۔ آپ نے قیمتی
شیروانی پہن رکھی ہے مگر گلا دیکھیے تو اس پر آدھ انچ میل جما ہے اور جو شیروانی
اتروا کر کُرتا ملاحظہ کیا جائے تو تعفّن سے دم گھٹے۔ اس امارت کا کسی پر خوشگوار
اثر نہ ہو گا۔ لوگ صاف ستھرے لباس کو زیادہ پسند کرتے ہیں بہ نسبت قیمتی مگر میلے لباس

گیے۔ قائدِ اعظم کی زندگی پر روشنی ڈالنے کی غرض سے اب تک جتنے مضامین شائع کیے گئے ہیں ان میں اس بات کا ذکر خاص طور پر کیا جاتا ہے کہ وہ خوش پوش تھے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ان کی عظمت میں لباس کو زیادہ دخل تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی شخصیت کو دل کش بنانے میں اُن کی خوش پوشی کا کسی قدر حصہ ضرور ہے۔

خوش مزاجی ایسا وصف ہے جس کے بغیر حلقۂ احباب میں عظمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر آپ کے ہونٹ مسکراہٹ سے ناآشنا ہیں۔ آپ ہر وقت چین بر جبیں رہتے ہیں۔ آپ کی آنکھوں میں محبت کے بجائے نفرت اور بیزاری کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اگر آپ ضرورت سے زیادہ متین ہیں تو سمجھ لیجیے کہ آپ نے اپنے اور دوسرے انسانوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر رکھی ہے اس لیے آپ کا ان سے ملاپ ممکن نہیں۔ یہ جدو جہد اور کشمکش کا زمانہ ہے۔ ہر انسان کھانے کمانے کی فکر میں مبتلا ہے۔ اس پر مستزاد متاہل زندگی کی کلفتیں۔ لوگ دوستوں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو اس لیے کہ ان کے پاس بیٹھ کر حالِ دل کہنے سے دل کا بار ہلکا کریں۔ ان کے لطائف سن کر زندگی کی تلخیوں کو بھول جائیں مگر آپ ہیں کہ مجسم غم و الم بنے بیٹھے ہیں۔ چہرے سے وحشت برس رہی ہے۔ آپ کا دوست تلخیوں سے بھاگ کر آپ کے پاس آتا ہے اور آتا ہے شادمانی حاصل کرنے مگر آپ اسے پناہ دینے کے بجائے تلخیاں دیتے ہیں۔ بتائیے وہ آپ کو دوست کیوں سمجھے گا ؟ آپ سے دوستی کی پینگیں کیوں بڑھائے گا ؟

اگر آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ سے دُور رہنا پسند نہ کریں۔ آپ کو دیکھ کر بھاگ

نہ جائیں۔ آپ کو تپاک سے ملیں۔ آپ کی دلچسپی ہی سے دلچسپی لیں۔ آپ کی مسرت میں اضافے کا ذریعہ بنیں تو خوش رہنا سیکھیے۔ خوش مزاجی کو اپنایئے۔ مسکرانا سیکھیے۔ چارلس شویب کہا کرتا تھا "میری مسکراہٹ کی قیمت دس لاکھ ڈالر ہے۔" مسکراہٹ کی قیمت دس لاکھ ڈالر؟ ہی ہیں۔ اس کی مسکراہٹ قیمتی تھی بہت قیمتی۔ وہ اس جادو سے دلوں کو مسخر کیا کرتا تھا۔ چارلس غم کو کامیابی کا سب سے بڑا دشمن سمجھتا تھا۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ اس سے تعلق رکھنے والا کوئی انسان غمگین نہ ہو۔ وہ اپنے ماتحتوں کو مسکراہٹ دے کر خوش رکھا کرتا تھا اور ان سے زیادہ کام لیا کرتا تھا۔ پھر آپ کیوں اس طلسم سے کام نہ لیں اور اس نسخے کو نہ آزمائیں؟

بعض لوگ اپنی زندگی موہوم خطرات کی بنا پر دکھی بنا لیتے ہیں۔ "اگر مجھے فلاں کاروبار میں نقصان ہو گیا تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔ اگر اس ہفتے کے اندر بارش نہ ہوئی تو میری فصل برباد ہو جائے گی۔" یہ اگر مگر، خوشیوں کی دشمن ہے۔ اس دشمن سے نجات یوں حاصل کی جا سکتی ہے کہ ہم موہوم خطرات سے نہ گھبرائیں۔ زندگی اور مسرت کو ہم معنی سمجھیں اور خوش رہنے کی کوشش کریں۔ ہم کبیدہ خاطر ہوں تو اس سے ہماری ذات کو صرف یہی نقصان نہیں پہنچتا کہ ہم کام کے قابل نہیں رہتے بلکہ دوست بھی چھن جاتے ہیں اس لیے کبیدہ خاطر رہنا چھوڑ دیجیے۔ چہرے پر آسودگی پیدا کیجیے۔ آنکھوں میں مسکراہٹ اور لبوں پر تبسم۔ دوستوں سے ملیے تو یہ ظاہر کیجیے کہ آپ دنیا کے سب سے زیادہ خوش قسمت انسان ہیں۔ آپ شاید نہیں جانتے کہ آپ کے لبوں پر کھیلنے والا تبسم مقناطیسی کشش رکھتا ہے۔ یہی تبسم آپ کے دوستوں کو آپ کی طرف کھینچ لائے گا۔

جب وہ محسوس کریں گے کہ آپ کے پاس بیٹھنے سے ان کی کلفتیں دُور ہوتی ہیں تو آپ کی صحبت کو غنیمت سمجھیں گے۔

ایک بات اور بھی یاد رکھیے۔ بدگمانی اور عیب جوئی کی عادت دوستی کی دشمن ہے۔ جو لوگ دوسروں میں عیب ڈھونڈتے اور ان کی تشہیر کرتے ہیں۔ انھیں کوئی قابلِ اعتماد نہیں سمجھتا۔ کوئی مُنہ نہیں لگاتا۔ آپ دوست کے مُنہ پر اس کی تعریف کر رہے ہیں مگر جونہی وہ پیٹھ موڑتا ہے آپ اس کا مضحکہ اڑانا شروع کر دیتے ہیں یا اس کے مخالفین کے پاس جا کر اس کی مذمت کرتے ہیں تو سمجھ لیجیے کہ آپ کی دوستی کو کوئی اعتماد کے قابل نہ سمجھے گا۔ بعض لوگ کانا پھوسی اور افواہ پسندی کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ شاید نہیں جانتے کہ کانا پھوسی شک و شبہہ کا سبب بنتی ہے۔ اگر آپ بھری محفل میں کسی فرد کے کان میں کچھ کہتے ہیں تو حاضرین میں سے بعض کو یہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان کے خلاف سازش کر رہے ہیں یا ان کا مضحکہ اڑا رہے ہیں اور ان کی ذاتی کمزوریوں کو ہدفِ مزاح بنا رہے ہیں۔ دوستوں کے متعلق کسی سُنائی باتوں کو پھیلانا بھی ناروا ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ جسے آپ دوست بنانا چاہتے ہیں دوسروں کے سامنے ہمیشہ اس کی اچھائی بیان کیجیے تاکہ جب اس تک یہ بات پہنچے کہ آپ ہر مجلس میں اس کی تعریف کرتے ہیں تو وہ آپ کا گرویدہ ہو جائے۔

دوست کے انتخاب کا مسئلہ اسی قدر اہم ہے جس قدر دوست بنانے کی اہمیت کا۔ دوستوں کے انتخاب میں حزم و احتیاط کی ہمیشہ تلقین کی گئی ہے "صرف ان آدمیوں کو دوست بنائیے جو دوستی کی قدر و قیمت جانتے ہوں جو دوست کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے ہوں حتیٰ کہ جان تک نثار کر سکتے ہوں۔ یہ ہے

وہ نظریہ جو بالعموم دوستی کے متعلق پیش کیا جاتا ہے۔ میں اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ دوستی ہو تو فی الواقع ایسی ہو کہ اپنے مفاد سے دوست کے مفاد کو عزیز سمجھا جائے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ دوستانہ تعلقات قائم کرنے میں اتنی سختی نہ برتیے ان لوگوں سے بھی دوستانہ تعلقات قائم کرنے سے نہ ہچکچاتیے جو نیک اطوار ہوں، خوش کردار اور خوش خلق ہوں۔ وہ آپ پہ جان قربان نہ کر سکیں تو بھی ان سے تعلقات قائم رکھیے۔ جان قربان کرنے والا دوست تو ایک آدھ ہی ہو سکتا ہے مگر زندگی میں ہمیں واسطہ پڑتا ہے بیسیوں انسانوں سے پھر کیوں نہ ان میں سے اچھی سیرت اور اخلاق والے انسانوں سے ہمارے مراسم خوش گوار ہوں۔ میری تمنا ہے کہ آپ دنیا میں کامیاب ہوں، اپنے آپ کو پہچانیں اور اپنی پوری قیمت وصول کریں۔ . . . .

اس مقصد کے لیے آپ کو اپنے تعلقات کا حلقہ وسیع کرنا پڑے گا مگر تعلقات انھیں لوگوں سے قائم کیجیے جو نیک اطوار ہوں، جن کے عزائم بلند ہوں جنھوں نے ذاتی سعی و کوشش سے کامیابی حاصل کی ہو، جو مجسّم عمل ہوں تاکہ ان کی صحبت میں رہ کر آپ کا حوصلہ بلند ہو۔ آپ میں جذبۂ عمل پیدا ہو۔ جب مصائب کی گھٹائیں گھر گھر کر آئیں، آپ مایوس ہونے کو ہوں تو ان کے حوصلہ افزا خیالات سے آپ نئی زندگی پائیں اور دُرِ مقصود حاصل کرنے کے لیے جد و جہد پہ مستعد ہو جائیں۔

جہاں تک دوسروں کا تعاون حاصل کرنے اور ان سے کام لینے کا تعلق ہے اُن افراد کو دوست سمجھیے، دوست بنائیے جو آپ کے ساتھ کام کرتے ہیں جو

براہِ راست یا بالواسطہ آپ کی ترقی پر اثر ڈال سکتے ہیں۔ حکّام بالادست سے آپ حتیٰ الامکان بگاڑ نہ کیجیے۔ انھیں اپنا ہمدرد بنائیے۔ ان کے مکان پر حاضری دے کر اور چلمیں بھر کر نہیں بلکہ اپنی قابلیت سے انھیں رام کیجیے۔ جو کام آپ کے سپرد ہے اسے خوش اسلوبی سے انجام دیجیے۔ آپ کا افسر کسی مشکل میں گرفتار ہے اور آپ کی مدد سے اس کی مشکل دُور ہو سکتی ہے تو اپنی خدمات پیش کیجیے مگر سلیقے سے۔ اس کی 'انا' کو مجروح کرنے کی غرض سے نہیں، نہ اپنے آپ کو اس سے زیادہ قابل ظاہر کرنے کی نیّت سے۔ اس کی امداد کیجیے مگر تشہیر نہ کیجیے کہ "جو کام آپ کا افسر انجام نہیں دے سکتا وہ آپ کر سکتے ہیں"۔ جن لوگوں کے سامنے آپ اپنا کارنامہ بیان کر رہے ہیں ان میں سے کوئی لگانے بجھانے میں ماہر ہو سکتا ہے اور وہ آپ کے افسر کو جا کر بتا سکتا ہے کہ آپ اسے بھری محفل میں رسوا کر رہے تھے۔

اپنے ساتھیوں سے بات بات پر تکرار نہ کیجیے۔ ان پر یہ ظاہر نہ ہونے دیجیے کہ آپ اپنے کو ان سے لائق اور افضل سمجھتے ہیں، ورنہ وہ سب حسد کرنے لگیں گے۔ آپ کو بدنام کرنے کے لیے متحدہ محاذ بنا لیں گے اور اس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک آپ کا زوال نہ دیکھ لیں۔ اس قسم کی مخالفتوں سے مردِ میدان ڈرا تو نہیں کرتے لیکن کیا خبر آپ میں تابِ مقاومت بھی ہے یا نہیں؟ اور اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جب خوشگوار تعلقات قائم رکھنے سے بھی آپ اپنا نصب العین حاصل کر سکتے ہیں تو بگاڑ سے فائدہ؟ جب آپ انھیں حسنِ سلوک سے گرویدہ بنا سکتے ہیں تو پھر مخاصمت کی ضرورت؟ اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ سب سے اچھے تعلقات قائم رکھیے۔

ان کی مشکلات میں ہاتھ بٹائیے۔ کسی کی گرہ کھول لیے مگر یوں کہ اسے محسوس نہ ہو، آپ کا جذبۂ ہمدردی خلوص پر مبنی نہیں۔

جب صبح صبح پہلی مرتبہ دفتر میں آئیں تو سب کو "صبح بخیر" کہیے۔ صرف رسم پوری نہ کیجیے بلکہ دل سے بھی یہی چاہیے۔ وہ جونیئر کلرک جو آپ کے سامنے بیٹھا کرتا ہے اس کی بچی عذرا کل سے بیمار ہے۔ وہ کل پچھلے پہر چھٹی لے کر اسی وجہ سے تو گیا تھا کہ بچی کو ہسپتال لے جائے گا۔ کیا آپ نے اس سے دریافت کیا ہے کہ اب بچی کا کیا حال ہے؟ نہیں تو اس غلطی کی فوراً تلافی کیجیے " عذرا بڑی پیاری بچی ہے۔ اس کی صحت کا خیال رکھا کیجیے۔" اگر آپ اپنی زبان سے یہ جملے ادا کر دیں تو آپ کو کیا تکلیف ہو گی اور اگر شام کو دو چار منٹ کے لیے بیمار پرسی کے لیے چلے جائیں تو کیا حرج ہے؟ دو چار آنے کا پھل لے جا سکیں تو اس سے بھی دریغ نہ کیجیے۔ آپ چار آنے ضائع نہیں کر سکتے تو ہرگز ضائع نہ کیجیے۔ عذرا کا باپ آپ کی ہمدردی کا بھوکا ہے، چار آنوں کا نہیں۔ عذرا کو پھل نہ دیجیے، مگر پیار کے الفاظ کا تحفہ پیش کرنے میں کیوں قارون بنیں؟ اپنے ماتحتوں سے تھوڑی سی ہمدردی کیجیے گا تو وہ آپ کے رہینِ احسان ہوں گے۔ جہاں کہیں آپ کو دیکھیں گے بچھ بچھ جائیں گے اور ضرورت پر آپ کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ مجھے یاد ہے ایک ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس اپنے ہیڈ کلرک سے اچھا سلوک کیا کرتا تھا۔ یہ ہیڈ کلرک بہت حسّاس تھا۔ وہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کے اس احسان کا ہمیشہ اعتراف کیا کرتا تھا اور ایک بار اس نے اس ڈسٹرکٹ انسپکٹر کی عزت بچانے کے لیے اپنی بست سالہ ملازمت خطرے میں ڈال دی۔ ہوا یوں کہ

جب اس ڈسٹرکٹ انسپکٹر کا تبادلہ اس ضلع سے کسی دوسرے ضلع میں ہو گیا۔ تو ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین نے جس کا ڈسٹرکٹ انسپکٹر سے ہمیشہ اختلاف رہا کرتا تھا" اسے کسی بدعنوانی کے سلسلے میں معطل کرانے کی کوشش کی۔ اگر ہیڈ کلرک چیئرمین کی بات مان لیتا تو چیئرمین اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا مگر اس نے اپنے محسن ڈسٹرکٹ انسپکٹر کے خلاف شہادت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس پر اسے ملازمت سے علیحدہ کرنے کی دھمکی دی گئی مگر بے سود۔ اس پر رشوت ستانی کا الزام عائد کیا گیا۔ اسے معطل کر دیا گیا۔ اس کے خلاف کئی مہینے تحقیقات ہوتی رہی اور اس کے دوران میں بار بار اسے کہا گیا کہ اگر وہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر کے خلاف شہادت دینے پر تیار ہو جائے تو اسے معاف کیا جا سکتا ہے مگر وہ احسان فراموشی پر آمادہ نہ ہوا۔

۴۔ کتابیں، بہترین دوست

لارڈ میکالے کا قول ہے کہ "اگر مجھے دُنیا کا شہنشاہ بنا دیا جائے۔ میرے رہنے کے لیے خوبصورت محل ہوں۔ سیر و تفریح کے لیے باغیچے۔ کھانے کے لیے لذیذ کھانے اور پوشش کے لیے عمدہ ملبوسات۔ سواری کے لیے اعلیٰ قسم کی بگھیاں اور خدمت کے لیے سیکڑوں خدام مہیا کیے جائیں لیکن ساتھ ہی یہ شرط ہو کہ انعامات کی یہ بارش اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ میں کتابیں نہ پڑھ سکوں گا تو میں شہنشاہ بننے سے انکار کر دوں گا اور ان نعمتوں سے دست کش ہو جاؤں گا بلکہ ایسے شہنشاہ بننے پر ایک مفلس انسان کی حیثیت سے ایک تنگ و تاریک کٹیا میں جہاں کتابیں موجود ہوں زندگی بسر کرنے کو ترجیح دوں گا۔" لارڈ میکالے ہی پر کیا موقوف ہے، ہر وہ انسان جو کتاب کو بہترین دوست سمجھتا ہے، اس پیش کش کو ٹھکرا دے گا اور وہ حق بجانب ہو گا کیونکہ کتابیں انسان کی بہترین دوست، مونس اور غمگسار رہیں۔

آپ کے دوست آپ سے بگڑ سکتے ہیں۔ آڑے وقت پہ دھوکا دے سکتے ہیں۔ ساتھ چھوڑ سکتے ہیں لیکن کتابیں کبھی دھوکا نہ دیں گی۔ آپ مایوس ہوں گے تو حوصلہ بڑھائیں گی۔ غمگین ہوں گے تو غم غلط کرنے میں مدد دیں گی۔ سفر میں، حضر میں، ہر جگہ، ہر مقام پر ان کی صحبت سے لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ وہ صرف دل

بہلانے کا سامان نہیں بلکہ رہنما اور خضرِ راہ بھی ہیں۔ وہ مفید مشورے دیتی ہیں اور حلِ مشکلات کے طریقے بتاتی ہیں۔ کتابوں کے ذریعے سے آپ زمانۂ حال کے اکابر کے ساتھ چل پھر سکتے ہیں تو ماضی کے مشاہیر کے مفید نصائح سے بھی فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ کتابوں کے توسط سے آپ اَن دیکھی سرزمینوں کی سیاحت کر سکتے ہیں۔ طویل مسافتیں ناپ سکتے ہیں۔ قطب شمالی تک پرواز کر سکتے ہیں۔ اور ماؤنٹ ایورسٹ کے گرد و نواح کے حالات معلوم کر سکتے ہیں لیکن یاد رکھیے بُرے دوستوں کی طرح بُری کتابوں سے بھی بچ کر رہنا ضروری ہے۔ پچھلے دنوں ایک انگریز نوجوان کو ڈاکوؤں کے کارنامے پڑھ پڑھ کر پولیس سے مقابلے کا شوق چرّایا۔ یہ شوق اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ اس کی موت کے بعد اس کی جیب سے ایک تحریر برآمد ہوئی جس میں لکھا تھا کہ اس نے ڈاکا مارنے کے افسانے پڑھ کر دل میں ٹھان لی کہ وہ بھی اُن بہادروں کی طرح پولیس کا مقابلہ کر کے نام پیدا کرے گا۔ امریکہ کا ایک صحافی لکھتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بہت سے نوجوان مار دھاڑ کی فلمیں دیکھ کر اور افسانے پڑھ کر بھٹک جاتے ہیں۔ دن دہاڑے بنکوں اور خزانوں کو لوٹنے کی کوشش میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اور بعض مارے جاتے ہیں۔ ایک قدیم روسی کہانی میں بتایا گیا ہے کہ بُری کتابوں کے مصنفین نوعِ انسان کے بڑے دشمن ہیں۔ ان ڈاکوؤں اور قاتلوں سے بڑے دشمن جو لوگوں کو لُوٹتے اور قتل کرتے ہیں۔ کیونکہ ڈاکو اور قاتل کا ظلم ہنگامی ہوتا ہے۔ ایک قاتل جب تک زندہ رہتا ہے ظلم کرتا ہے انسان کا خون بہاتا ہے۔ اسی طرح ایک ڈاکو اس وقت تک لوگوں کو لُوٹتا ہے جب تک وہ طاقت رکھتا ہے۔

لیکن بُری کتابیں لکھنے والوں کا ظلم ہمیشہ جاری رہنے والا فتنہ ہے۔ ان کے مرنے کے بعد بھی ان کی کتابیں موجود رہتی ہیں اور انسانی دل و دماغ کو مسموم کرتی رہتی ہیں۔ اس لیے کتابوں کے انتخاب میں احتیاط لابدی ہے۔

"مشاہیر یونان و روما" کا دیباچہ نگار لکھتا ہے "اگر ایک شریف آدمی ایک بدمعاش سے بے تکلف باتیں کرتا ہو تو آپ اس کے اس فعل کو بُری نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن اگر وہ اس سے زیادہ بُری کتاب پڑھتا ہے جس کی ہر بات شربت کے گھونٹ کی طرح حلق سے اُتر رہی ہے جس کے باطن میں بُرے مگر بظاہر خوبصورت نقوش اس کے دل میں مرتسم ہو رہے ہیں تو نہ آپ کو ناگوار گزرتا ہے، نہ شریف آدمی ہی کو شرم محسوس ہوتی ہے۔" آگے چل کر لکھتے ہیں "آپ ناواقف آدمی سے بات کرتے ہوئے جھجکتے ہیں لیکن ناواقف کتاب کو شوق سے پڑھتے ہیں حالانکہ یہ فعل پہلے سے بھی زیادہ بیہودہ ہے۔" دیباچہ نگار مذکور نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ کتابوں کے انتخاب میں احتیاط اشد ضروری ہے۔ ہمیشہ اچھی کتابیں پڑھیے۔ الہامی کتابوں کی افادیت کو زیرِ بحث لانا تو بیکار ہے۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ ان کا مطالعہ تزکیۂ نفس کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے البتہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم "تلاوت" ہی کو کافی نہ سمجھیں بلکہ نگاہِ تعمق سے مطالعے کی عادت ڈالیں اور ان پر غور و فکر کیا کریں تاکہ وہ اسرار و رموز جو مقدس کتب میں پنہاں ہیں، ہم پر کھُل سکیں۔

ان لوگوں کے سوانحِ حیات کا مطالعہ کیجیے جنھوں نے نسلِ انسانی کی فلاح و بہبود کی خاطر قربانیاں دیں۔ انسانیت کی بہتری کے لیے زندگیاں وقف کیں اور

مفید ایجادات و اختراعات کی صورت میں اپنی مساعی کا ثمرہ ہمارے لیے چھوڑ گئے۔ ان مذہبی رہنماؤں کی سیرت کا مطالعہ کیجیے جنھوں نے ابنِ آدم کو بدی کی راہ سے بچانے کی خاطر دکھ سہے جنھوں نے قوموں کو غلامی کے بندھن سے آزاد کرایا۔ اقوام و ملل کے زوال و عروج کے اسباب کیا ہیں؟ علاوہ بریں معیاری ادبی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ ان کا مطالعہ دل و دماغ کو تفریح بخشتا ہے۔ فنونِ لطیفہ کی جس شاخ سے دلچسپی ہے اس کے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُنھیں پڑھیے۔ اپنے کاروبار کے متعلق لٹریچر کا مطالعہ کرنا تو معلومات میں اضافہ کر کے ترقی کی راہ ہموار کرنا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کتابوں کا مطالعہ کیجیے جو زندگی بنانا سکھاتی ہیں، جو جد و جہد پر مستعد کرتی ہیں، دل میں جوش اور ولولہ پیدا کر کے مشکلات کا مقابلہ کرنے پر تیار کرتی ہیں۔ جن لوگوں نے ذاتی سعی سے افلاس و ناداری کے جنگل سے نجات حاصل کی۔ فرش سے عرش پر پہنچے۔ جن کے والدین انھیں تعلیم نہ دلا سکے مگر انھوں نے اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل کر کے علوم و فنون میں دسترس حاصل کی۔ جن کے والدین دو وقت کے کھانے کے محتاج تھے مگر انھوں نے ذاتی محنت سے دولت حاصل کی۔ جن کے والدین کو کوئی پوچھتا تک نہ تھا مگر انھوں نے ملکوں پر حکومت کی۔ قوموں کی قسمت بنائی جنھوں نے کامیابی کے مندر میں داخل ہونے کے لیے اپنا راستہ خود بنایا ان کے سوانحِ حیات پڑھیے ضرور پڑھیے۔ رات کی تنہائی میں جب آپ کام کاج سے فارغ ہو چکے ہوں، اولوالعزم انسانوں کے سوانحِ حیات پڑھیے۔ لنکن کو یاد کیجیے۔ مصطفیٰ کمال کی صحبت میں بیٹھیے۔ سٹالن سے بات چیت کیجیے۔ تاکہ آپ بھی ان کی طرح مشکلات کا مقابلہ مردانہ وار کر سکیں۔ آفات کو دیکھ کر ڈر نہ جائیں۔ تکالیف سے

ہراساں ہو کر ہتھیار نہ ڈال دیں۔ جب مایوسیوں کے بادل چاروں طرف سے گھیر لیں تو دیکھیں کہ ابراہیم لنکن نے کیا کیا تھا۔ کیا اس نے شکست قبول کر لی تھی ؟ جب کاروبار میں ناکام ہونے کا خدشہ ہو تو راک فیلر اور اینڈریو کارنیگی سے پوچھیے کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے۔ جب دشمن قوی دکھائی دے اور آپ محسوس کریں کہ اس بڑے دشمن کے مقابلے پر آپ نہیں ٹھہر سکتے تو مصطفیٰ کمال اور قائدِ اعظم سے مشورہ کیجیے کہ آیا آپ کو راستی کی راہ اس لیے چھوڑ دینی چاہیے کہ شیطنت کے پاس لاؤ لشکر ہے مگر آپ بے تاب و تواں ہیں۔ یہ کتابیں آپ کو زندگی کے اسرار بتائیں گی۔ زندگی بسر کرنے کا فن سکھائیں گی اور آڑے وقت پر آپ کو اس قابل بنائیں گی کہ آپ مایوسیوں کے طوفان کا مقابلہ کر سکیں۔ پلوٹارک کی کتاب "مشاہیر یونان و روما" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے مطالعے سے یورپ، کے سینکڑوں نوجوانوں نے زندگی بنائی، عزت حاصل کی اور بامِ عروج تک پہنچے۔ مصطفیٰ کمال، رضا شاہ پہلوی، قائدِ اعظم، سٹالن اور دوسرے مشاہیر کے سوانحِ حیات کا مطالعہ آپ کے لیے اسی طرح مفید ہو سکتا ہے جس طرح یورپ کے نوجوانوں کے لیے "سیر متو ازی" کا مطالعہ۔ ان مشاہیر کی زندگی ان لوگوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے گی جو دنیا میں کچھ بن کر اور کچھ کر کے دکھانا چاہتے ہیں۔ آپ علوم و فنون کے پرستار عالموں، سائنس دانوں اور فلاسفروں کے حالاتِ زندگی پڑھ کر بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اگر مسلمان نوجوان مسلمان علماء و فضلاء، قائدین عساکر، فاتحین، جغرافیہ دانوں اور فلاسفروں کے سوانحِ حیات پڑھیں گے تو انھیں معلوم ہو گا کہ ان بزرگوں نے تھوڑے عرصے میں طب، حکمت، تاریخ، جغرافیہ اور سیاست میں کیا کارنامے انجام دیے۔ آپ

دوست بنائیے تو اسی قسم کی کتابوں کو۔

اُن کتابوں کا مطالعہ بھی بے حد مفید ہے جو کامیابی کی راہیں دکھاتی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ قدرت نے کسی کو مفلس پیدا نہیں کیا بلکہ شہنشاہ بنا کر دنیا میں بھیجا ہے۔ ہر انسان امیر ہے۔ بہت بڑی دولت رکھتا ہے۔ ضرورت ہے تو اس بات کی کہ اس مخفی خزانے کو کھود نکالا جائے۔ نئے خیالات کی کتابیں انسان کا حوصلہ بڑھاتی ہیں۔ آپ اس قسم کی کوئی کتاب اُٹھائیے۔ ہر صفحے پر زندگی، کامیابی اور مسرت کا پیغام موجود ہے۔ آپ اس نوع کی کتابوں کا مطالعہ کریں اور آپ کے سینے میں یہ خواہش انگڑائیاں نہ لے کہ آپ کو کامیابی کا حق حاصل ہے اور دُنیا کی کوئی طاقت آپ کو کامیابی سے محروم نہیں رکھ سکتی؟ یہ ناممکن ہے قطعاً ناممکن۔

جو کتاب بتاتی ہے کہ قدرت نے کسی کو مفلس اور بے نوا پیدا نہیں کیا۔ جو لوگ بلند خیال ہیں، نصب العین رکھتے ہیں، محنت کرتے ہیں، مشکلات سے نہیں ڈرتے وہ ضرور پاتے ہیں۔ وہ موچی کے لڑکے ہوں، جونگی کے محرر کے فرزند ہوں، لوہار کے بیٹے ہوں، یا لکڑہارے کے نورِ نظر، کامیابی کے مندر میں داخل ہو کر رہتے ہیں جو کتابیں کہتی ہیں لنکن، فرنکلن، سٹالن، مسولینی، ہٹلر، نپولین، فورڈ، کارنیگی، مصطفیٰ کمال، لینن اور بیسیوں غریب لڑکے ترقی کر سکتے ہیں تو آپ کیوں معراجِ ترقی تک نہ پہنچ سکیں؟ آپ اپنے آپ کو ترقی کا اہل کیوں نہ سمجھیں؟ اُنھیں ضرور پڑھیے، انھیں حرزِ جان بنا لیجیے، انھیں دوست بنائیے، انھیں عزیز رکھیے پھر دیکھیے کہ آپ کی زندگی میں انقلاب آتا ہے یا نہیں؟

متفرقات

۱- کامیابی کا راستہ

مقناطیس لوہے کی بنی ہوئی چیزوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے لیکن ربڑ، لکڑی یا کوئی اور چیز جس میں لوہے کے اجزا نہ ہوں، اس کی کشش سے متاثر نہیں ہوتی۔ بچپن میں آپ نے مقناطیسی نعل سے کھیلتے وقت دیکھا ہوگا کہ وہ سوئی کو تو کھینچ لیتا ہے مگر دیا سلائی اس کی کشش سے متاثر نہیں ہوتی۔ وہ صرف انھیں اشیاء کو کھینچتا ہے جن سے اس کا لگاؤ ہوتا ہے۔

انسان بھی فطرتاً مقناطیس ہے اور صرف انھیں اشیا سے تعلق رکھتا ہے جو اس کے مزاج کے مطابق ہوں، اس کے عادات و خصائل سے مناسبت رکھتی ہوں۔ ہمارا دل انھیں اشیاء کو اپنی طرف کھینچے گا جو اسے پسند ہیں، جن کی چاہت میں وہ مبتلا ہے۔ ہمارے جذبات اصل میں ہمارے دل کے ترجمان ہیں اس لیے ہم انھیں اشیا کی خواہش کرتے ہیں جنھیں ہمارا دل چاہتا ہے اگر ہمارے خیالات اعلیٰ ہوں گے تو ہماری زندگی بھی بہتر ہوگی۔ اگر ہم ڈر اور یاس کے خیالات کا شکار رہیں گے تو عملاً ڈرپوک اور مایوس انسان ہوں گے۔ لوگ ناخوشی اور بدقسمتی کے خلاف لڑتے تو ہیں اور ان کے گلے بھی کرتے ہیں، لیکن یہ نہیں جانتے کہ انھوں نے اپنے آپ کو فطری مقناطیس سے علیحدہ کر رکھا ہے

اس لیے اچھی چیزوں سے محروم ہیں۔

دہ ہمیشہ ان اشیاء کے متعلق سوچیے جنھیں حاصل کرنے کی تمنا ہے۔ اُن الفاظ میں عمیق فلسفہ موجود ہے۔ ان اشیاء کے متعلق سوچیے جنھیں آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں حاصل کرنے کے ذرائع پر غور کیجیے اور تندہی سے سرگرم کار ہو جائیے۔ یہ ہے صحیح راہ۔ یہ آپ کو ایسا مقناطیس بنائے گی جو اچھی اشیاء کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔

جب بھی آپ ناامیدی اور شکست سے بچنا چاہیں تو پہلے وسوسوں کو دور کیجیے۔ اپنی فتح کا یقین رکھیے۔ فتح کے خیالات دل و دماغ میں بسائیے۔ پھر آپ شکست سے محفوظ رہیں گے۔ آپ کی ناکامی کی وجہ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو کہ آپ ایک سمت جا رہے ہیں تو آپ کے خیالات دوسری سمت۔ اس لیے اپنے خیالات اور اعمال میں ہم آہنگی پیدا کیجیے۔ ایلی کیڈی کہتا ہے "کسی چیز کی خواہش اس بات کی دلیل ہے کہ لاانتہا خزانوں کا مالک آپ کو وہ چیز ضرور دے گا بشرطیکہ آپ کی طلب صادق ہو اور آپ اس کے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔"

اس بات کی پروا نہ کیجیے کہ آپ کی موجودہ حالت کس قدر پست ہے اور مستقبل بظاہر کس قدر تاریک۔ دل میں کامیابی کے خیالات بسائیے۔ عزم صمیم سے کام لیجیے۔ اپنے آپ کو فاتح سمجھیے۔ مرکز کامیابی پر نگاہ جمائے رکھیے۔ کسی پست خیال کو دل میں جگہ نہ دیجیے۔ دل کو کسی گھٹیا عمارت کی بنیاد نہ بنائیے اور کامیابی کی رانی کو دل کے تخت پر بٹھائیے۔ پھر مصیبت آپ کے پاس تک نہ پھٹکے گی

اور آپ عزت و اقبال حاصل کر سکیں گے۔

جب کرافورڈ نے امریکہ میں اپنا کام شروع کیا تو ہفتے عشرے تک قصبات اور دیہات میں چکر لگاتا رہا۔ ایک رات کسی تھیٹریکل کمپنی کے ایک رکن نے اس کا کام دیکھ کر کہا "تمھارا کام اچھا نہیں۔ تم امریکہ میں کبھی کامیاب نہ ہو سکو گے۔ تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے وطن سکاٹ لینڈ واپس چلے جاؤ اور وہیں قسمت آزمائی کرو"۔ مگر کرافورڈ بلند حوصلہ تھا، وہ اس تنقید پر ناراض نہ ہوا بلکہ اپنا کام زیادہ محنت اور مستقل مزاجی سے کرنے لگا۔ بالآخر کامیابی نے اس کے قدم چومے اور وہ امریکہ ہی میں کامیاب ہو کر رہا۔

کرافورڈ کامیاب ہوا کیونکہ وہ تخیل میں اپنے آپ کو کامیابی کا مستحق سمجھتا تھا۔ اس نے نا امید اور بزدل بنانے والے خیالات کے بجائے کامیابی کے خیالات سے واسطہ رکھا۔ اپنے ضمیر کی قیادت قبول کی اس لیے کامیاب ہوا۔ ہمارے ضمیر کی آواز الہامی آواز ہے۔ ایک شاعر لکھتا ہے "اے دل تو بلندی پر ہے عظمت رکھتا ہے۔ پھر ایسے خیالات سے جو کم ہمت شکست کیے دیتے ہیں، کیوں خوف زدہ ہے؟ کیا تو نہیں جانتا کہ پست خیالات کے مقابلے پر ایک اور آواز ہے ضمیر کی آواز جو سلامتی اور طمانیت بخشتی ہے۔" اس لیے اپنے ضمیر کی آواز سنیے، اس کے احکام مانیے، اس سے قطع تعلق نہ کیجیے، اس کے غلط ہونے کا شبہ نہ کیجیے اور کبھی خیال نہ کیجیے کہ آپ اچھی چیزوں کے اہل نہیں۔

ہماری ناکامی کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم ظاہری حالت سے اکثر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ ظاہری بدنصیبی کو بدلا جا سکتا ہے۔ ہم نے کبھی ان

خزانوں کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جو ہماری قسمت میں لکھے جا چکے ہیں اور
جو ہمارے اندر موجود ہیں۔ ہم اپنی قوتِ بازو پر بھروسا نہیں کرتے۔ ہمیں یقین نہیں ہوتا
کہ ہم انھیں حاصل کر سکتے ہیں اس لیے بدقسمتی اور بدنصیبی پر صبر کر بیٹھتے ہیں۔ گویا
اپنی زندگی کم فہمی کی وجہ سے برباد کر لیتے ہیں۔ ہم صرف راہ کی مشکلات کو دیکھتے
ہیں مگر یہ حقیقت فراموش کر دیتے ہیں کہ انسان نام ہے اس جنس کا جو ان مشکلات
پر فتح حاصل کرتی ہے۔ بنجمن ڈسرائیلی یہ راز جانتا تھا۔ جبھی اس نے کہا
"انسان مواقع سے پیدا نہیں ہوا بلکہ انھیں پیدا کرتا ہے۔" اور اس نے اس
قول کی صداقت اپنی زندگی میں ثابت کر دکھائی۔ وہ ذات، قوم اور مواقع کے لحاظ
سے ہیٹا تھا مگر یہ نوجوان یہودی تمام مشکلات پر غالب آیا اور انگلستان کا وزیرِ اعظم
بن کر رہا۔ لائل نے یہ شعر کہ کر صرف شاعرانہ نازک خیالی نہیں کی بلکہ یہ حقیقت
بیان کی ہے کہ "جو کچھ ہم اپنے اندر رکھتے ہیں وہی کچھ کسی مناسب لمحے پر بن کر
رہتے ہیں۔" شاعر، سائنس دانوں اور فلاسفروں سے زیادہ بلندی پر پرواز کرتا ہے۔
اس کے تخیلات پر کے ڈانڈے الہام سے ملتے ہیں۔ وہ کامیابی کا راستہ دکھاتا
ہے، راستہ جو کامیابی کے مندر کی طرف جاتا ہے۔ شاعر یقینی طور پر مستقبل کی راہیں جانتا
اور دیکھتا ہے، وہ مناسب لمحات کو جانتا ہے۔ مناسب لمحے جو ہمارے خوابوں
کی صحیح تعبیر ہوتے ہیں۔ اس لیے لائل نے جو حقیقت بتائی ہے اس سے فائدہ
اٹھایا جائے۔

وہ لوگ جو کامیابی کے مقامِ بلند تک پہنچے پہلے تصور میں اس بلندی تک پہنچے
تھے۔ وہ اپنے آپ کو تصور میں اس بام پر بیٹھے دیکھا کرتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ

وہاں تک پہنچنا سہل ہے۔ اگر آپ عروسِ کامیابی سے وصال چاہتے ہیں تو اُن جیسا عزم پیدا کیجیے اور انھیں کی طرح مصروفِ عمل ہو جائیے۔

اگر آپ ناکامیوں اور شکستوں کو یاد کر کے دل چھوڑ بیٹھے ہیں۔ پست خیالی کے مریض ہیں اور اپنے خیالات کے مطابق عمل نہیں کر پاتے۔ اگر آپ کی زندگی حلاوت سے یکسر خالی ہے۔ اگر آپ کے خاکے بے رنگ پڑے ہیں۔ اگر آپ کو افلاس نے دبوچ لیا ہے تو یہ آپ کا اپنا کیا دھرا ہے۔ قسمت یا خدا پر الزام عائد کرنا فضول ہے۔ کیونکہ ہم وہی کچھ پاتے ہیں جن کے متعلق سوچتے ہیں۔

بعض کامیاب آدمیوں کے متعلق سُننے میں آتا ہے کہ وہ جس کام کو ہاتھ میں لیتے ہیں اس میں کامیاب ہوتے ہیں یا جس چیز کو چھوتے ہیں وہ سونا بن جاتی ہے۔ جانتے ہیں آپ اس کی وجہ کیا ہے؟ محض یہ کہ وہ جس کام کو ہاتھ میں لیتے ہیں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا مکمل یقین رکھتے ہیں۔ اپنے خیالات کو جامۂ عمل پہناتے ہیں یعنی ایسے مقناطیس بنتے ہیں جو کامیابی کو اپنی طرف کھینچتا ہے وہ عقل، عطیۂ ایزدی کو کام میں لاتے ہیں جس سے ہر انسان کام لے سکتا ہے۔ پھر آپ اس زندگی بخش قوت سے کام کیوں نہیں لیتے؟ اپنے ارادوں کے مطابق جو کسی مبارک لمحے میں آپ کے پاس آتے ہیں، کام کیوں نہیں کرتے؟ کیا آپ اتنی سی بات بھی نہیں جانتے کہ پاکیزہ خیالی اور استقلال سے اپنے پسند کی چیزیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

جب تک اودھامابیے سلسلہ ہائے راکی تک کا علاقہ صحرا سمجھا جاتا رہا اسے ناکارہ زمین کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ بعض مدبر اس بات پر حیرت کا اظہار کیا۔

کرتے تھے کہ قدرت نے یہ لاکھوں ایکڑ زمین بے فائدہ کیوں بنا ڈالی! جب امریکی کانگرس میں یہ مسئلہ پیش ہوا کہ حکومت پیسفک ریلوے یونین کو مسوری سے ساحل بحرالکاہل تک ریلوے لائن بنانے میں مدد دے تو ویبسٹر جیسے مدبّر نے اس کا خیر مقدم طنزیہ مسکراہٹ سے کیا اور کہا "اس ریلوے لائن کی تعمیر پر روپیہ صرف کرنا عوام کا روپیہ ضائع کرنا ہے۔ یہ علاقہ کسی کام کا نہیں۔ یہاں ریلوے لائن بنانا بے فائدہ ہے۔ بس اونٹوں کے ذریعے سے ڈاک لانے اور لے جانے کا انتظام کر دیا جائے"۔ مگر دنیا نے دیکھ لیا کہ پیسفک ریلوے یونین کا یہ خیال صرف خواب موہوم نہ تھا بلکہ حقیقت تھی، قابل عمل حقیقت، اس ریلوے لائن کی تکمیل سے پہلے ہی کھیتیاں آباد ہو گئیں۔ شہر بس گئے۔ اس قدر جلد گویا یہ عظیم کام جادو کے زور پر ہوا ہے۔

ابن آدم بھی اپنے اندر ایسا ہی صحرا رکھتا ہے جو اس بات کا منتظر ہے کہ کوئی اسے آباد کرے۔ اس دولت کو لوٹ لے جو اس صحرا میں موجود ہے۔ ان خزینوں کو حاصل کرے جو اس میں دفن ہیں۔ مگر اپنی ذات پر مکمل اعتماد ہی ہم پر یہ انکشاف کرے گا۔ جب بھی ہم اپنے آپ پر بھروسا کرنا سیکھ جائیں گے، ہماری زندگی مسرتوں اور خوشیوں سے لبریز ہو جائے گی۔ جیمز ایلن سچ کہتا ہے "جیسا سوچو گے ویسا بنو گے"۔

کسی چیز کے ایک رُخ کا تاریک ہونا اس پر دال نہیں کہ دوسرا رُخ بھی ایسا ہی تاریک ہو گا۔ ظاہری مایوسانہ آثار اندر کی دولت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ بعض لوگ کسی کو دولت مند دیکھ کر کہتے ہیں "اس کی قسمت کتنی اچھی ہے!" دوسر

کو عقلمند پا کر فرماتے ہیں" اس نے کتنی عمدہ تعلیم و تربیت حاصل کی ہے! کسی خوش اخلاق اور نیک سیرت آدمی کو دیکھ کر پکار اُٹھتے ہیں" خدا اس پر کس قدر مہربان ہے! مگر وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ اچھی چیزیں حاصل کرنے میں ان افراد کو کن مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ کتنی قربانیاں دینی پڑیں۔ نیز انھیں اپنی ذات پر کس قدر اعتماد تھا۔

جو لوگ ناکام رہتے ہیں شاید اس امر سے آگاہ نہیں کہ ان کی ناکامی کی وجہ سرگرمی سے کام نہ کرنا ہے۔ یاد رکھیے آپ کی موجودہ حالت آپ کے خیالات کا ثمرہ ہے۔ جو کسان زمین کی تیاری کے بغیر فصل بوتا ہے وہ معمولی فصل حاصل کرتا ہے۔ اگر آپ بھی سرزمین دل کو گھٹیا خیالات کی گھاس پات سے صاف نہ کریں گے تو اچھی فصل حاصل نہیں کر سکتے۔

ذرا اس غریب الوطن بچے کی ہمت دیکھیے جو امریکہ میں آتا ہے تو اس کے پاس سرمایہ کیا ہوتا ہے۔ صرف تن کے کپڑے۔ وہ ہماری زبان جانتا ہے نہ معاشرت سے آگاہ ہے۔ یہاں اس کا کوئی دوست بھی نہیں مگر وہ اُن مشکلات پر عبور حاصل کرتا ہے اور ان امریکی نوجوانوں سے آگے بڑھ جاتا ہے جو اس سے زیادہ اچھے مواقع رکھتے تھے۔ وجہ کیا؟ صرف یہ کہ اسے ہر وقت اپنی بہبود کا خیال تھا اور وہ جن چیزوں کے حاصل کرنے کی تمنا رکھتا تھا انھیں حاصل کرنے کی جدوجہد بھی کرتا تھا۔ وہ پہلے پہل گلیوں میں اخبار بیچتا ہے۔ جب اس کی حالت کسی قدر بہتر ہو جاتی ہے تو اخبارات کی ایجنسی لیتا ہے اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے مدارس شبینہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو بہتر سمجھتا اور بہتر بناتا ہے۔ قدم بقدم آگے بڑھتا

ہے۔ اس ایجنسی کو چھوٹی سی دکان میں منتقل کرتا ہے اور اس میں اخباروں کے علاوہ کتابیں اور سٹیشنری رکھتا ہے حتیٰ کہ ایک دن ہم اسے ایک خوبصورت دکان کا مالک اور کاروباری پاتے ہیں۔ وہ کامیابی حاصل کرتا ہے کیونکہ وہ دولت مند بننے کے قانون کی پیروی کرتا ہے۔

گو دولت حاصل کرنے کے جذبات اعلیٰ درجے کے جذبات نہیں سمجھے جا سکتے پھر بھی اس غریب الوطن بچے کی کامیابی ہمارے لیے ہر شعبے میں کامیاب بننے کی غرض سے مشعلِ راہ ضرور ہے۔ یوں بھی دولت حاصل کرنے کا نظریہ اخلاقی نہیں تو غیر اخلاقی بھی نہیں۔ کم از کم اس کا ثبوت تو ہے کہ کامیابی کا انحصار دل یعنی خیالات پر ہے۔ خیال ہمیں جہاں سینیور ولا اور لنکن بنا سکتا ہے تو ایک خود غرض انسان بھی۔ ایک آدمی قوتِ خیال کے ذریعے سے استاد یا واعظ بن سکتا ہے تو دوسرا ہوٹل کا منیجر۔ غرض جس قسم کے خیالات ہوں گے ویسا نتیجہ برآمد ہو گا۔ جب ماہر عمارت کسی عمارت کا خاکہ دیکھتا ہے تو کاغذ پر پنسل سے جو خطوط کھینچے گئے ہیں انہیں دیکھنے پہ قناعت نہیں کرتا بلکہ اس عمارت کو بھی دیکھتا ہے جو اس کے دل میں خاکے سے پہلے تعمیر ہوئی تھی۔ خاکہ بذاتِ خود کوئی چیز نہیں۔ آپ کی زندگی کا نقشہ بھی آپ کے آپ کے اندر موجود ہے۔ اگر آپ اپنے مستقبل کی عمارت کی بنیاد اچھے خیالات سے رکھ سکتے ہیں۔ اگر آپ کامیابی کے خواہاں ہیں تو اچھے خیالات کو مستقبل کی عمارت کی بنیاد بنائیے۔

جو لڑکا معاشرتی ترقی کا دلدادہ ہوتا ہے وہ قہوہ خانوں، ناچ گھروں اور ہوٹلوں میں دکھائی دے گا۔ جو علم کا طالب ہے۔ وہ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے اور مدارس شبینہ

ہیں نظر آئے گا تو کبھی اس کی زیارت کسی کتب خانے میں ہو گی۔ اس بات کو جانے دیجیے کہ وہ انجینئر بن رہا ہے یا فیشن کا دلدادہ ہے یا کتابوں کا۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ آیا وہ اپنے خیالات کے مطابق کامیاب ہو رہا ہے یا نہیں ؟

آپ کا دل انھیں چیزوں کو اپنی طرف کھینچ سکے گا جو اس کی پسند کی ہیں۔ اگر ہم مایوسی کے خیالات رکھتے ہیں تو نا امیدی ہماری قسمت ہو گی۔ ہماری زندگی اصل میں ہمارے خیالات کا عکس ہے اور ہماری شخصیت ہمارے خیالات کا نتیجہ۔ بہت سے لوگ اپنی زندگی ڈر، یاس اور خوف کے خیالات سے تباہ کر لیتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ یہ سب کچھ ان کا اپنا کیا دھرا ہے۔ وہ ہمیشہ بُرے ماحول اور دوستوں سے شکوہ سنج ہیں مگر نہیں جانتے کہ اپنے دشمن آپ ہیں۔

انسانی دل و دماغ نے بارہا ثبوت مہیا کیے ہیں کہ پاکیزہ اور عمدہ اشیاء کا تصور کیا جائے، ان کے حصول کے لیے جد و جہد کی جائے تو وہ حاصل ہو سکتی ہیں اس لیے آپ کبھی پروا نہ کیجیے کہ آپ کا ماحول کتنا مایوس کن ہے، موجودہ حالت کتنی ناتسلی بخش ہے۔ اگر آپ نے بلند خیالی کو شعار بنایا۔ دل میں کامیابی کی عمارت تیار کی اور اس کے لیے جد و جہد کی تو اسے ضرور حاصل کریں گے۔

اگر حالات ناسازگار ہیں اور واقعات ناموافق تو اس کی پروا نہ کیجیے نکتہ چینی سے نہ ڈریے۔ ناکامی کے خیال کو دماغ پر حاوی نہ ہونے دیجیے۔ اگر دنیا بے وقوف کہتی ہے تو اسے کہنے دیجیے۔ لوگ تو مسیح اور بدھ کو بھی ایسا کہتے رہے۔ ضمیر کی راہنمائی میں آگے بڑھتے جائیے، وہ صحیح رہنما ہے۔ گزرے ہوئے مصائب کو بھول جائیے، پھر ستارۂ امید طلوع ہو گا اور آپ اندھیرے سے اُجالے میں

آجائیں گے۔

بلا شبہ آپ کو مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے، تکالیف سے دو چار ہونا پڑا ہے۔ قربانیاں دینی پڑی ہیں جس کے باعث آپ آگے بڑھنے سے متذبذب ہیں لیکن میری مانیے، اپنے خیالات پر قابو پایئے اور اگر کسی سخت حادثے سے دو چار ہونا پڑتا ہے تو بھی ڈٹے رہیے۔ آپ کی بلند خیالی اور کام آپ کے اصلی معاون ہیں انھیں دوست بنایئے، پھر کامیابی ہی کامیابی ہے۔

بہت سے آدمی ایسے ہیں جو یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ کیونکر کامیاب ہوئے؟ کس طرح تاریکی سے نکل کر روشنی میں آئے؟ انھوں نے کس طریق سے مشکلات پر قابو پایا؟ لیکن محنت سے مُنہ نہ موڑا۔ اپنے مرکز سے نگاہ نہ ہٹائی۔ ان کا عزم ان کا رہنما بنا۔ انھیں مصیبتوں کی تاریک وادی میں روشنی دکھاتا رہا اور تصریا امیدی سے باہر نکال لایا۔ وہاں جہاں فضا خوشگوار ہے، ماحول خوش کن۔ جہاں فتح و نصرت کا سرچشمہ بہتا ہے۔

اس بات کی پروانہ کیجیے کہ راستہ تاریک ہے اور کام دشوار۔ آپ کے ساتھ ایک شمع جلتی ہے جو راہ کے اندھیرے کو دُور کرتی ہے۔ وہ جو دُور اندھیرا نظر آرہا ہے اس سے نہ گھبرایئے۔ جونہی آپ شمع لے کر اس کے قریب پہنچیں گے وہ آگے چل دے گا حتیٰ کہ آپ منزل تک پہنچ جائیں گے۔ وہ شمع یقین کامل ہے۔ آپ کو یقین ہونا چاہیے کہ آپ سیدھی سمت جارہے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ ایمان ہونا چاہیے کہ اگر ہم نے اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دیا تو فطرت مخفی خزانوں کے در کھول دے گی۔ کامیابی کی تمنا ہے تو مشاہیر کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کیجیے ان

کے نقشِ قدم پر چلیے۔ اُنھیں کی طرح پیش قدمی کیجیے۔ جُوں جُوں آپ آگے بڑھتے جائیں گے اندھیرا راہ چھوڑتا جائے گا، مخفی خزانوں کے در کھُلتے جائیں گے اور آپ مزے لوٹیں گے۔

گڈ ایر، ربڑ کے کارخانے کا مالک بننے سے پہلے خیال پرست تھا۔ مورس ٹیلیگراف کی ایجاد سے پہلے تخیّل پرست تھا۔ ڈبلیو فیلڈ بھی سمندر میں پیغام رسانی کا حیرت انگیز خیال رکھتا تھا۔ اگر ایلی وٹنی خیال پرست نہ ہوتا تو لوگ ابھی تک کپاس ہاتھ سے چُنتے۔ ملغرافی مارکونی کے خوابوں کے بغیر ابھی ایک صدی تک ایجاد نہ ہوئی ہوتی۔ الگزینڈر گراہم بل کے خوابوں کی مہربانی سے ہم بے تار پیام رسانی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ فلپ گریفن کے خوابِ آزادی کے بغیر ہمارے وطن اب تک غلامی کے بندھن میں گرفتار ہوتے۔

کامیابی مستقل عزم کی رہینِ منت ہے۔ اگر کسی چیز کے حاصل کرنے کی تمنّا ہے تو اسے دل میں بسائیے۔ اسے حاصل کرنے کا راستہ خود بخود بن جائے گا۔ موجد، سائنس دان، رہنمایانِ قوم اور وہ لوگ جنھوں نے شہریت اور تہذیب کو چار چاند لگائے مشکلات کے باوجود ترقی کے افق تک پہنچے۔ کوئی مصیبت ان کے سدِّ راہ نہ ہو سکی۔ وہ سفر کے آغاز سے پہلے نہ جانتے تھے کہ راستہ کیونکر بنے گا مگر انسانی قوتِ ارادی نے یہ مشکل حل کی حقیقت یہ ہے کہ فتح اس کی قسمت میں ہے جو کوشش کرتا ہے اور آگے بڑھتا ہے۔ مشکلات کے کتنے پہاڑ اور سمندر اس کی راہ میں آئیں وہ اُنھیں خاطر میں نہیں لاتا اور کولمبس کی طرح استقلال سے کام لیتا ہے۔ آپ بھی ترقی کر سکتے ہیں بشرطیکہ کولمبس کی طرح مستقل مزاج ہوں۔ کامیاب وہی ہو سکتا

ہے جو خطرات سے نہیں ڈرتا اور صرف موت ہی اس کے عزم کا راستہ روک سکتی ہے۔

خواہش یا ارادہ کامیابی کی بنیاد ہے۔ تمدن کا مدار خواہشات پر ہے۔ ہر ریل گاڑی خواہشات کا سٹور ہے۔ ہمارے گھر ارادے نے بنائے۔ لائبریریاں ہمارے مصنفین کے ارادوں کے مخزن ہیں۔ ہمارے مدرسے، ہمارے دارالعلوم ان کے بنانے والوں کے ارادوں کے مظہر ہیں۔ غرض تمام ادارے قوتِ ارادی کے طفیل معرضِ وجود میں آئے۔ آپ بھی اپنی قوتِ ارادی سے کام لیجیے۔

ہم اس دنیا میں انسانیت کی سربلندی کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ اپنے ضمیر کی رہنمائی قبول کیجیے اور دیکھیے کہ آپ کیونکر انسانیت کی خدمت کر سکتے ہیں۔ اس کے ارشاد کو ملنیے۔ اس کے احکام کی تعمیل کیجیے۔ کسی اور طرف نہ دیکھیے۔ بہتری کے خیالات کو اپنا بنائیے۔ پھر اخلاق کی تکمیل میں ان کے کرشمے دیکھیے۔ سوئیز کہتا ہے "خدا کے بے شمار خزانے آپ کے لیے ہیں، انھیں حاصل کرنے کی کوشش کیجیے۔"

(ترجمہ از مارڈن)

۲۔ جرأت کا امتحان

میں ایک خاتون کو جانتا ہوں جسے زندگی میں بہت آلام برداشت کرنے پڑے۔ اس کا اکلوتا بیٹا جنگِ عظیم میں کام آیا۔ اس کی ماں اور خاوند بیک وقت نمونیے کا شکار ہوئے۔ ان مصائب سے اس کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ محسوس کرنے لگی کہ اس کا جینا بے کار ہے۔ وہ آج تک غم والم کے بادلوں میں گھری ہوئی ہے۔ ستم ہائے روزگار کا رونا روتی ہے اور کسے معلوم ہے کہ یہ دل شکستہ خاتون کب تک آہ وزاری کرتی رہے گی؟ کیا وہ ہماری ہمدردی کی مستحق نہیں؟

اب غور کیجیے جب دنیا میں اس قسم کے انسان موجود ہیں جنھیں ہماری امداد اور ہمدردی کی اشد ضرورت ہے تو ہم شکارِ یاس کیوں ہوں؟ اور مشکلات کے مقابلے میں ہتھیار کیوں ڈال دیں؟ اگر ہم خود ناامید بن گئے تو ان لوگوں کی کیا مدد کر سکیں گے جو ہم سے زیادہ دکھی ہیں؟

کیا آپ اس لیے شکست تسلیم کر رہے ہیں۔ کہ آپ کی امیدوں کا خون ہو گیا اور حالات ناسازگار بن گئے؟ لیکن یہ عذر قابلِ سماعت نہیں۔ آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ آپ کی شکست کا حتمی فیصلہ ہو چکا ہے؟ آپ اپنی خواہشات سے دست کش کیوں ہوتے ہیں؟ اگر راستہ ابھی تک دشوار گزار ہے تو اس کا

مطلب یہ ہے کہ آپ نے پوری محنت سے کام نہیں کیا۔ اس لیے ہار ماننے کے بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ مستقل مزاجی سے کام کیے جائیے اور تحمل سے نتیجے کے منتظر رہیے۔ ہم اس دُنیا میں احسن کام انجام دینے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ اگر ہم نے مشکلات سے ڈر کر کام ادھورا چھوڑ دیا۔ یا نیکی کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے اپنے حصے کا فرض ادا نہیں کیا۔

پچھلے دنوں میں ایک خاتون کے حالاتِ زندگی پڑھ رہا تھا۔ اس خاتون کے بچے اور تمام متعلقین نہنگِ اجل کا لقمہ بن گئے تھے۔ اس پر وہ زلیست سے بیزار ہو گئی اور اپنی موت کی دعائیں مانگنے لگی۔ لیکن اس اثنا میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔ جس نے اس کا مطمحِ نظر بدل دیا۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک یتیم بچّی کی نگہداشت اس کے سپرد کی گئی۔ اس ننھی، خوبصورت مگر یتیم بچی کو مادرانہ شفقت کی ضرورت تھی۔ مگر وہ خاتون چونکہ اپنی اولاد کھو بیٹھی تھی۔ اس لیے اس نے یتیم بچی میں زیادہ دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اس نے خیال کیا کہ اس بچی کو ماں کا پیار دینا اور اس کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھنا فرضِ اوّلین ہے۔ اسے اس نیکی کا ثمرہ یہ ملا کہ وہ اپنا غم بھول گئی۔ اس نے زندگی کا راز پا لیا اور دوسروں کے غم ہلکا کرنے کی ٹھان لی۔ کہتے ہیں کہ اُس نے گزشتہ بیس سال میں دو سو سے زائد یتیم بچیوں کو یتیمی کی مصیبتوں سے بچایا اور انھیں مستقبل کی قابل اور تربیت یافتہ مائیں بنایا۔

قدرت ہم پر بہت مہربان ہے۔ وہ لاثانی ڈاکٹر ہے۔ وہ ہمارے زخموں

پر مرہم کا پھاہا رکھتی ہے اور ہماری ذہنی بیماریوں کو عجیب و غریب طریقوں سے دور کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم شاید ہی زندگی کا بار اٹھا سکتے کیونکہ دنیا میں ایسے انسان کم ہی ہوں گے جنھیں کبھی غم و الم کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

دنیا میں ایسے ہزاروں انسان موجود ہیں جنھوں نے راست روی کے باوجود بہت نقصان برداشت کیا لیکن چیں بہ جبیں نہ ہوئے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ شکست ناآشنا ہیں اور ناکامیوں کو کامیابیوں کا زینہ سمجھتے ہیں حقیقت میں کسی آدمی کی قابلیت کے جوہر اُس وقت کھلتے ہیں جب حالات اُس کے موافق نہ ہوں مگر وہ نہ گھبرائے۔ راستہ تاریک ہو مگر وہ منزل نہ بھولے اور جب دوست اسے کہیں کہ قسمت کے خلاف معرکہ آرائی نامناسب ہے تو وہ ان کی نصیحت کو درخورِ اعتنا نہ سمجھے اور اپنی جدوجہد جاری رکھے۔

اس بات کی پروا نہ کیجیے کہ راہ پُر خطر ہے یا بار زیادہ ہے۔ ثابت قدم رہیے بوجھ نہ پھینکیے اور اس وقت کا انتظار کیجیے جب مصیبت کے بادل چھٹ جائیں گے اور آپ منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے۔

"آخری اور اٹل فیصلہ رہینِ منت ہے آپ کی جرأت، قابلیت اور قوتِ انتخاب کا۔ جب تک آپ کو ہر طرف تاریکی سوجھے گی۔ کامیابی کا قلعہ ناقابلِ تسخیر دکھائی دے گا اس وقت تک آپ اپنی بہبود کے لیے اقدام نہ کر سکیں گے کیونکہ بزدلی کامیابی کی دشمن ہے۔

میں ایسے بہت سے آدمیوں کو جانتا ہوں جنھوں نے موہوم نقصان سے بچنے کے لیے اپنا گھر بار اور اثاثہ بیچ ڈالا۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ ایسا کیے بغیر نقصان

اٹھائیں گے مگر بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ ان کی گھبراہٹ بلا وجہ تھی۔ ہم دُنیا کے اکثر کام محض اس لیے نہیں کرتے کہ ہمیں ڈر ہوتا ہے کہیں ناکام نہ ہو جائیں۔ ایسے ہی لوگ کامیابی سے محروم رہتے ہیں۔

پروا نہیں اگر آپ کی حالت نا تسلی بخش ہے اور مستقبل بظاہر تاریک۔ مرکز سے نگاہ نہ ہٹائیے۔ عزم و ارادہ کی عنان تھامے رکھیے۔ نصب العین کو نہ بھولیے۔ اپنی کامیابی کا یقین رکھیے۔ اپنے آپ کو وہ آدمی سمجھیے جو آپ بننا چاہتے ہیں۔ نگاہوں میں انفعال نہ پیدا ہونے دیجیے۔ عدم اعتماد کو دل کی سرزمین میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیجیے۔ اپنی خواہشات کے پورا ہونے کا بھروسا رکھیے اور پوری قوت سے آگے بڑھیے۔ یہی ہے وہ راستہ جو منزلِ مقصود تک لے جائے گا۔ اور اسی مرہم سے آپ کے زخموں کا اندمال ہوگا۔

جو انسان ناامیدی اور بیقراری پر قابو نہیں پا سکتا وہ معمولی خطرات پر گھبرا جاتا ہے۔ جو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کر سکتا وہ دنیا کی نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔ اس لیے آپ مشکلات کا مقابلہ کرنے کے واسطے ہمیشہ مستعد رہیے۔ انھیں آسانیوں میں تبدیل کرنا سیکھیے۔ سیپی اپنے خول میں پڑی ہوئی ریت کو باہر نہیں نکال سکتی تو اسے موتی بنا دیتی ہے۔

ایک اپاہج خاتون لکھتی ہے "میرے پاس دُنیا کو دینے کے لیے کوئی چیز نہ تھی پھر بھی میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنا دکھڑا بیان کر کے کسی اور کو غمگین نہ بناؤں گی۔ اس عزم کے بعد بھی مجھے اپنی مصیبت پر رونا آتا تھا مگر میں مسکراتی تھی۔ میں بدقسمت تھی مگر خوش رہتی تھی۔ تاکہ لوگ مجھ سے اور کچھ حاصل نہیں کر سکتے تو کم از کم مسرت کا تحفہ ہی لے سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب میں دوسروں کو خوش کرنے کے لیے خوش نہیں رہتی بلکہ اپنی

مصیبت بھول چکی ہوں اور خود بھی شرابِ مسرت سے بے خود رہتی ہوں۔"

یہ اس عورت کی حالت ہے جو برسوں سے اپنے گھر سے باہر نہ نکلی تھی۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھی رہتی ہے۔ مایوس لوگ اس کے پاس آتے ہیں اور اس سے جرأت و مسرت کے تحفے لے جاتے ہیں۔ اس کے جسم میں اب بھی درد ہوتا ہے۔ وہ اس قدر مجبور ہے کہ باہر کی دُنیا سے قطع تعلق کر چکی ہے۔ وہ اپنی کرسی سے درختوں کی صرف چوٹیاں دیکھ سکتی ہے، مگر اس کی آنکھیں اور اس کے ہونٹ مسکراتے ہیں اور دوسروں کو مسکراہٹ دیتی ہے۔

کیا کوئی آدمی اس عورت کو جو اپنے احباب کو خوشی اور امید کا جذبہ دیتی ہے، اس لیے مفلس، ناکام اور بد نصیب کہہ سکتا ہے کہ وہ برسوں سے اپنے کمرے میں بند ہے؟ نہیں وہ حقیقت میں کامیاب ہے، خوش نصیب ہے۔ اس کے پاس لازوال دولت ہے۔ وہ دولت جو غم اور ناامیدی کو دُور کر دیتی ہے۔ وہ دولت جو کبھی چُرائی اور چھینی نہیں جا سکتی۔ وہ سورج کی طرح سب کو روشنی دیتی ہے۔ اس کا رتبہ ان لوگوں سے بلند ہے جو ظاہری دولت پر نازاں ہیں۔

وہ دل جو سچائی کا مخزن ہے، خود غرضی، کم بینی اور جسمانی عوارض پر فتح پاتا ہے۔ اس لیے اپنے اندر جھانکیے۔ بزدلی اور بیماری کے خیالات کو باہر نکال دیجیے۔ پھر فتح آپ کی ہے۔ ہینلے کے ہم نوا ہو کر یہ گیت گائیے "شب کی تاریکی ایک عالم پر چھائی ہے لیکن مجھے کیا؟ میری روح تو غیر مفتوح ہے۔" خدائے آفرینش پر بھروسا رکھیے۔ ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ خواہ اس پر مصائب کے پہاڑ کیوں نہ ٹوٹ پڑیں وہ بزدل نہ بنے۔ جرأت سے کام لے۔ مستقل مزاجی سے کام کرتا رہے۔ یہی ہمارا فرض ہے اور یہی ہماری پیدائش کی غرض و غایت۔

(ترجمہ از مارڈن)

۳۔ عزمِ صمیم

مغرب کے کسی شخص نے ایک ہوائی جہاز بنایا اور دعویٰ کیا کہ اب ہوائی سفر خطرات سے محفوظ ہو کر رہے گا۔ مغرب نے اس صدا پہ یقین کیا اور خوشی کا اظہار کیا مگر مشرق کے عافیت پسندوں نے اس کا مضحکہ اڑایا اور اس آواز کو جنون اور خودستائی سے تعبیر کیا۔ مغرب والوں نے اس دعوے کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے کے لیے ہوائی سفر اختیار کیا اور اپنی جانیں اس نصب العین کے حصول پر بھینٹ چڑھا دیں۔

حقیقت ہیں آر ۱۰۱ کی کامیاب پرواز سے انسانی فتوحات میں قابل قدر اضافہ ہوتا مگر قدرت کو شاید انسانی عزم کا ابھی اور امتحان لینا تھا۔ چنانچہ آر ۱۰۱ کو پہلی اڑان پر شاید حادثہ پیش آیا۔ وہ نذرِ آتش ہو گیا اور یورپ کے بہت سے معزز سپوت اس حادثے میں موت کی دائمی نیند سو گئے۔ یورپ ہمت اور اولوالعزمی کے دربار سے بہ انعام حاصل کر کے بڑا متحیر ہوا۔ بظاہر انسان کی بے بسی کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی تھی کہ محفوظ ترین ہوائی جہاز بمشکل تمام برطانیہ سے فرانس تک پرواز کر سکے جب غیر محفوظ ہوائی جہازوں میں نئی دنیا تک پرواز کی جا چکی ہو۔ لیکن یہ تحیر جلد مستعدی اور سرگرمی سے بدل گیا۔ اخباربین حضرات جانتے ہیں کہ ان شہدائے عزم و استقلال کا ماتم بڑے اہتمام سے منایا گیا اور وزیراعظم برطانیہ نے ماتمی جلوس کو خطاب کرتے ہوئے جاں بحق ہونے والوں کے متعلقین سے اظہارِ ہمدردی

کیا وہاں یہ بھی کہا "ہماری یہ ناکامی آئندہ کامیابی کا پیش خیمہ ہے۔ ہم ہوا کو فتح کرکے رہیں گے اور ہوائی سفر خطرات سے محفوظ ہو کر رہے گا۔"

آر ۱۰۱ اکس موجد کی دماغی کاوش کا نتیجہ تھا۔ اس میں کتنی نشستیں رکھی گئیں۔ اسے آگ کیونکر لگی اور برطانیہ کے کون کون سے اکابر اس میں بیٹھے تھے جنہیں جام مرگ پینا پڑا؟ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرے لیے تو قابل غور معما "ہوا کو فتح کرکے رہیں گے، ہوائی سفر خطرات سے محفوظ ہو کر رہے گا" ہے۔ میں اس قوم کی جرأت اور اولوالعزمی پر غور کرتا ہوں جس کے سپوت ایک تجربے کے لیے اپنی جانوں کی پروا نہیں کرتے اور جو اپنے مقتدر فرزندوں کی جانیں گنوا کر بھی اپنے ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے پر مستعد نظر آتے ہیں۔

بلاشبہ ہوائی سفر خطرات سے محفوظ ہو کر رہے گا جو قوم ہوا کے سمندر میں تیر سکتی ہے وہ اپنی حفاظت کا انتظام بھی کر سکے گی۔ صدیوں اڑن کھٹولے کا طلسم ہمارے دماغ میں بسا رہا۔ ہم اسے اعجاز یا طلسم سمجھتے رہے مگر مغرب والوں نے سچ مچ کا اڑن کھٹولا بنا لیا۔ اب وہ ہوائی سفر بے خطر بنانے میں کیا کچھ نہ کر گزریں گے؟ یورپ کی ترقی کا راز اس کی یہی اولوالعزمی ہے۔ اپنے خیالات کو بلند رکھنا اور انھیں لباس عمل پہنانے کے لیے کارزار حیات میں سرگرم ہونا کامیابی کا دوسرا نام ہے۔ جن لوگوں نے دنیا میں بلند رتبے حاصل کیے جو شہرت کے آسمان پر ستارے بن کر چمکے ان کے سوانح حیات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ترقی نتیجہ تھی ان کے عزم صمیم کا۔

اگر نپولین فوج کا معمولی عہدہ دار بن جانے پر قناعت کرتا۔ اگر بنجمن فرینکلن تہذیب و تمدن کے مراکز سے چالیس میل دور ایک کٹیا میں زندگی بسر کرنے پر راضی رہتا۔ اگر

جیمز گارفیلڈ بڑھئی بن جانا ہی غنیمت جانتا۔ اگر مسولینی اپنے ارادوں کے خلاف باپ کا
پیشہ اختیار کر لیتا۔ اگر رضا خاں سپاہی بن جانے پر قانع رہتا تو وہ کبھی کامیاب نہ ہوتے۔
قوموں اور ملکوں کے ممتاز رہنما نہ بنتے اور بقائے دوام کے دربار میں نہ پہنچ سکتے۔ وہ کامیاب
ہوئے تو محض اس لیے کہ وہ کامیاب ہونا چاہتے تھے۔ اپنے آپ کو 'کمترین' نہ سمجھتے تھے۔
ان کا خیال تھا کہ قدرت نے انھیں 'بزرگ ترین' پیدا کیا ہے اور انھیں بلند ترین مناصب
حاصل کرتے دیکھنا چاہتی ہے۔ تاج و تخت کا حق دار سمجھتی ہے اس لیے انھوں نے
کوشش کی تو اس کا ثمرہ حاصل کیا۔

اولوالعزمی نے ہمارا تعارف نئی دنیا سے کرایا۔ ہمیں مفید ایجادوں سے روشناس
کرایا۔ ہمارے قدموں میں مخفی خزانے لا ڈالے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن قوموں نے بلند خیالی
سے کام لیا۔ وہ کامیاب رہیں۔ عرب کے بدو ساری دنیا پر اس وجہ سے چھا گئے کہ ان
کے عزائم بلند تھے۔ انگلستان کے مٹھی بھر باشندے ایک تہائی دنیا پر اس لیے قابض
ہوئے کہ وہ مضبوط قوتِ ارادی رکھتے تھے۔ ننھے منے جاپان نے جنگ میں اپنے عزم
کی بنا پر روسی ریچھ کو چاروں شانے چت گرا دیا۔ مشرق ابھر سکتا ہے تو صرف اسی صورت
میں کہ اس کے فرزند اولوالعزم بنیں۔ طوفانی لہروں کا مقابلہ کرنے پر تیار ہو جائیں
سہل انگاری چھوڑ دیں۔ خطرات میں گھس کر دُرِ مقصود حاصل کرنا شعار بنائیں۔ راضی
برضا رہنے کے فلسفے کو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھیں اور اپنی تقدیر خود بنائیں۔

قدرت متعصب نہیں۔ وہ یورپی باشندوں کی گوری جلد پر شیدا نہیں اور مشرق
کے سیاہ فام باشندوں سے اسے کوئی بغض نہیں۔ اس نے مغربیوں کو دل و دماغ
دیا تو مشرقیوں کو بھی۔ اس کا ثبوت تاریخ بہم پہنچاتی ہے۔ آج یورپ مہذب اور

ترقی یافتہ ہے مگر کسی دور میں ہم یورپ سے زیادہ مہذب تھے۔ ان دونوں ایجاد و اختراع کا سہرا اہلِ مشرقیوں کے سر رہا کرتا تھا۔ علوم و فنون میں وہ مغربیوں سے کوسوں آگے تھے۔ مگر جب وہ تساہل پسند بن گئے تو سب کچھ کھو بیٹھے۔ علم و فن کے میدان میں شکست کھائی تو پھر آزادی جیسی نعمت بھی کھو بیٹھے۔

وہ اب بھی آزادی حاصل کر سکتے ہیں مگر ضرورت ہے اس بات کی کہ اولوالعزم بنیں۔ علم و فن سے دلچسپی لیں۔ ایجاد و اختراع کے لیے دماغ لڑائیں اور مشرق کا کھویا ہوا وقار حاصل کریں۔

ہم قومی زندگی کی تعمیر چاہتے ہیں یا انفرادی ترقی کے طالب ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اولوالعزم بنیں۔ اپنے آپ کو ادنیٰ اور پست خیالات سے نجات نہ لائیں۔ بلند خیال بنیں۔ مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے مستعد ہوں۔ ہم مشرق کو مغربی تسلط سے نجات دلانا چاہتے ہیں یا کاروبار میں کامیابی کے متمنی ہیں۔ ضرورت ہے اس بات کی کہ استقلال سے کام لیں۔ کامیابی اور نفع کی قوی امید رکھیں تو ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔

۴۔ پھر کبھی

میرا ایک دوست پانچ سال سے آگرہ میں ملازم ہے مگر اس نے تا حال تاج محل نہیں دیکھا۔ دنیا کے گوشے گوشے سے لوگ تاج محل دیکھنے آتے ہیں لیکن میرے دوست کی آنکھیں تاج محل دیکھنے سے محروم ہیں۔ وہ تاج محل دیکھنے کا خواہاں ہے۔ اس نے مجھے کئی بار لکھا کہ وہ دنیا کی اس حسین عمارت کو دیکھ کر ایک حسین نظم لکھے گا۔ مگر کہتا ہے "تاج محل کہیں بھاگ نہ جائے گا۔ وہ کل بھی یہیں ہوگا، پرسوں اور اترسوں بھی اس لیے آج ہی دیکھنا ضروری نہیں جب اسے پھر کبھی دیکھا جا سکتا ہے۔" آپ منتظر ہوں گے جب اسے ہمیشہ یہی کہتا پائیں گے کہ وہ تاج محل ضرور دیکھے گا۔ لیکن وہ آج تک تاج محل نہیں دیکھ سکا۔

میرا ایک دوست پشاور میں دو سال تک مقیم رہا مگر درہ خیبر نہ دیکھ سکا۔ درہ خیبر کو دیکھنا کوئی ایسی مہم نہیں جو دو سال میں سر نہ ہو سکے۔ وہ اتنا بے حس بھی نہیں کہ اسے اس مشہور مقام کے دیکھنے کا شوق ہی نہ ہو۔ وہ اکثر کہا کرتا ہے "حفیظ جالندھری اگر درۂ خیبر پہ نظم نہ لکھتے تو میں انہیں کبھی شاعر نہ سمجھتا۔"

ایک ایسا آدمی جو درۂ خیبر پہ لکھی ہوئی نظم کو اتنا سراہتا ہے۔ اسے دیکھنے کا متمنی کیوں نہ ہوگا؟ مگر وہ دو سال میں خیبر نہ دیکھ سکا۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ سمجھتا تھا، وہ جب چاہے خیبر دیکھ سکتا ہے۔ اس نے بارہا خیبر جانے کی تیاری

کی لیکن اُسے محض اس لیے معرضِ التوا میں ڈال دیا کہ درۂ خیبر کا آج ہی دیکھنا ضروری نہیں، اُسے آئندہ ہفتے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اگلی پارٹی کے ہمراہ بھی مگر اسی اثنا میں اسے پشاور چھوڑنا پڑا اور وہ درۂ خیبر نہ دیکھ سکا۔

آپ ان کی حالت پر افسوس کریں گے، ممکن ہے اسے کوتاہ اندیش کہیں لیکن اس سے پہلے اپنی حالت پر غور کیجیے، کہیں آپ بھی اپنے کام کل پر تو نہیں اٹھا رکھتے؟ آپ نے عہد کیا تھا کہ اپنی زندگی کو بہت قیمتی سمجھیں گے اور فرصت کے لمحات ضائع نہ کریں گے۔ یونیورسٹی نے جو جماعتیں شامل کر رکھی ہیں۔ اُن میں سے کسی ایک میں شامل ہو کر قابلیت بڑھائیں گے۔ سو اب تک کسی جماعت میں شامل ہوئے یا ابھی تک داخلے کا ارادہ ہی ہے؟ ابھی آپ کو عمل کی توفیق نصیب نہیں ہوتی تو پھر آپ کی حالت ان سے بہتر کیونکر ہوئی؟

دُنیا میں ہزاروں آدمی ان حضرات کی طرح کام کرنا چاہتے ہیں مگر وہ ابھی تک انہیں انجام نہیں دے سکے اور غالباً وہ کام کبھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچیں گے کیونکہ یہ لوگ انہیں "پھر کبھی" انجام دینا چاہتے ہیں لیکن "پھر کبھی" آنے سے رہی۔

یہ کام آج کیوں کیا جائے جب کل بھی ہو سکتا ہے۔ اس نظریے کے علمبردار دراصل کام کرنا ہی نہیں چاہتے ورنہ "پھر کبھی" کے استعمال کی ضرورت ہی کیا تھی؟ جب وہ کام آج بھی ہو سکتا ہے تو اسے "پھر کبھی" پر ملتوی کیوں کیا جائے۔ یہ حقیقت کبھی فراموش نہ کیجیے کہ جس کام کے لیے "پھر کبھی" کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ کبھی انجام پذیر نہیں ہوتا کیونکہ "پھر کبھی" کبھی نہیں آتی۔ لغت میں "پھر کبھی" سب سے زیادہ ردی لفظ ہیں۔

اس دُنیا میں ایسے انسانوں کی قلت نہیں جنھیں قدرت نے غیر معمولی دل و دماغ دے کر قابلیت کا مالک بنایا لیکن زمانہ ان کے نام سے نا آشنا ہے کیونکہ ان "پھر کبھی" کے پجاریوں نے کبھی اپنی قابلیت کا اظہار نہیں کیا۔ اگر بنگال کا درویش صفت شاعر ٹیگور اور ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال "پھر کبھی" کے پجاری ہوتے، اپنی معرکۃ الآرا تخلیں "پھر کبھی" لکھتے تو دنیا ان کے نام سے واقف نہ ہوتی اور "گیتان جلی" اور "بانگِ درا" کبھی عدم سے وجود میں نہ آتیں۔

میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جو اگر وقت پر اپنی قابلیتوں سے کام لیتا تو آج بہترین صحافی اور نقاد شمار ہوتا۔ وہ جب کسی مبحث پر دلائل بیان کرتا ہے یا کسی ادبی موضوع پر خیالات ظاہر کرتا ہے تو سامعین پر اپنی عظمت کا سکّہ بٹھا دیتا ہے۔ اس کی تنقید صحیح معنی میں تنقید ہوتی ہے۔ جب اسے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ضبطِ تحریر میں لا کر ملک کے جرائد کو بھیجے تاکہ لوگ اس کے خیالات سے مستفید ہوں اور اسے بھی "شہرتِ عام" کے دربار میں پہنچنے کا موقع ملے تو وہ جواب دیتا ہے "جی ہاں آئندہ ہفتے میں ایک معرکۃ الآرا مضمون لکھوں گا جو ادبی دنیا میں تہلکہ مچا دے گا۔" لیکن جناب کا مضمون آج تک کسی جریدے میں شائع نہیں ہوا۔ چونکہ وہ بزرگ وہ مضمون کسی آئندہ ہفتے میں لکھنا چاہتے ہیں اس لیے امید نہیں وہ مضمون کبھی لکھا جائے۔

نہر پانامہ، اہرامِ مصر اور تختِ طاؤس "آج" نے بنائے۔ دلکش باغ، ہری بھری کھیتیاں "آج" کی بسائی ہوئی ہیں۔ قوموں کی تہذیب اور ملکوں کا تمدن "آج" کا رہینِ منت ہے۔ یقین جانیے "پھر کبھی" کہنے سے ہماری دنیا ابھی تک "پتھر کے زمانے" کی ہوتی۔

ترقی اور خوشی ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنا کام آج ہی بلکہ ابھی شروع کر دیتے

ہیں کیونکہ کل کہنے سے "آج" گزر جاتا ہے۔ کل کا آج بھی حتیٰ کہ کل کبھی نہیں آتا اور وہ لوگ جو اپنے کام "کل" انجام دینا چاہتے ہیں بے کل ہی رہتے ہیں۔

جن لوگوں نے نپولین کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یورپ کی قوموں نے اس بہادر جرنیل کے خلاف متحدہ محاذ بنایا۔ واٹرلو کے میدان میں فیصلہ کن مقابلہ ہوا۔ اور نپولین بونا پارٹ ہمیشہ کے لیے سینٹ ہلینا میں قید کر دیا گیا۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ اگر جرنیل "نے" نپولین کی ہدایت کے مطابق قلعہ گوائر براس پر رات کو قبضہ کر لیتا تو نہ واٹرلو کی جنگ ہوتی نہ نپولین سینٹ ہلینا میں قید و بند کے مصائب برداشت کرتا۔ اغلب ہے کہ دنیا کا نقشہ موجودہ نقشے سے مختلف ہوتا مگر جرنیل نے نپولین کے احکام کی کما حقہٗ تعمیل نہ کی۔ وہ ہمت کر کے قلعے کے قریب تو پہنچ گیا لیکن رات ہو گئی تھی۔ اس نے خیال کیا کہ صبح قلعے پر قبضہ کر لیا جائے گا۔ دشمن تو یہاں سے دور ہے وہ بمشکل تمام صبح تک یہاں پہنچ سکتا ہے ہم ان کے آنے سے پیشتر قلعے میں داخل ہو جائیں گے مگر دور کا دشمن راتوں رات قلعے میں در آیا اور سورج کے طلوع ہونے سے پیشتر ہی جرنیل "نے" نے اپنی غفلت کا خمیازہ بھگت لیا۔

اگر آپ عروسِ کامیابی سے ہمکنار ہونا چاہتے ہیں تو کام ابھی شروع کر دیجیے ورنہ کامیاب ہونے سے پہلے موت کا فرشتہ آپ کو گہری نیند سلا دے گا اور آپ کے تمام جوہر رائیگاں جائیں گے۔ وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے اور گھڑیال کی منادی زندگی کے لمحات کم کر رہی ہے پھر آپ اپنی حیاتِ مستعار کل کے انتظار میں کیوں ضائع کریں؟ اگر آپ ماضی کے مردے کو دفنا چکے ہیں تو ابھی میدانِ وغا میں مصروف ہو جائیے آپ کے حسین خواب صرف اسی صورت میں شرمندۂ تعبیر ہوں گے۔